جستجو کا سفر
ذیشان الحسن عثمانی

جستجو کا سفر

ذیشان الحسن عثمانی

Narratives Pvt.Ltd.

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	:	جستجو کا سفر
تالیف	:	ذیشان الحسن عثمانی
سرورق	:	طارق ایم سجاد
اشاعت	:	دسمبر 2012ء
تزئین	:	زاہد عمران
قیمت	:	-/175
تعداد	:	ایک ہزار
مطبع	:	بی پی ایچ پرنٹرز
ISBN	:	**978-969-9645-26-6**

پوسٹ بکس نمبر 2110، اسلام آباد
فون: 051-2613911
ای میل: info@narratives.pk
ویب سائٹ: narratives.pk

انتساب

اُن تمام سوالوں کے نام جن کے جواب میں
آج تک ڈھونڈ رہا ہوں۔

زندگی کے جتنے دروازے ہیں مجھ پر بند ہیں،
دیکھنا، حدنظر سے آگے بڑھ کر دیکھنا بھی جرم ہے۔
سوچنا، اپنے عقیدوں اور یقینوں سے نکل کر سوچنا بھی جرم ہے،
آسماں در آسماں اسرار کی پرتیں ہٹا کر جھانکنا بھی جرم ہے۔
کیوں بھی کہنا جرم ہے، کیسے بھی کہنا جرم ہے،
سانس لینے کی تو آزادی میسر ہے، مگر۔
زندہ رہنے کے لئے انسان کو کچھ اور بھی درکار ہے،
اور اس 'کچھ اور' بھی کا تذکرہ بھی جرم ہے۔
اے ہنرمندان آئین وسیاست،
اے خداوندان ایوان عقائد۔
زندگی کے نام پر بس اک عنایت چاہیے،
مجھکو ان سارے جرائم کی اجازت چاہیے۔

(احمد ندیم قاسمی)

جستجو کا سفر ایک فرضی اِصلاحی ناول ہے ۔تمام کردار وواقعات فرضی ہیں مگر یہ تمام کرداراور ماحول آ پ کوروزمرہ زندگی میں روزانہ نظر آئیں گے۔ یہ آپ بیتی ہے اُس مسافر کی جس کا سفر اُس کی مرضی کے بغیر شروع ہوا، جس کے راہبر بارہا اپنی سمت بدلتے رہے اور جس کا مقصدِ حیات لوگوں کی خواہشوں کی تکمیل رہ گیا، ہم دعوت دیتے ہیں آپ کو اس کہانی میں شرکت کی ،آیئے اور روانہ ہو جایئے ہمارے ساتھ اس سفر میں اور کوشش کریں سمجھنے کی ،اس ملک اس معاشرے اور اس سے پروان چڑھتے ہوئے نوجوانوں کو۔

ہمیں اپنی آراء سے ضرور مطلع فرمائیں۔
Zusmani78@gmail.com

عجب مسئلہ ہے درپیش
علم کو آگہی سے خطرہ ہے۔

دھوپ کی تمازت میں جلتے ہوئے اندرونِ سندھ کے ایک چھوٹے سے زرعی گاؤں میں زندگی ہمیشہ کی طرح سسکتے ہوئے گذر رہی تھی ،دوپہر کا وقت، مئی کا مہینہ، کچے راستوں پر جانور تک نظر نہیں آتے تھے، ایسے میں فضل دین[عرف فضلو] ایک گھر سے دوسرے گھر بھاگا جا رہا تھا۔

آج فضلو کے گھر میں بچے کی پیدائش متوقع تھی، اس سے پہلے چار بار یہ دن آیا مگر فضلو کا کوئی بھی بچہ ایک سال کی عمر تک نہ پہنچ سکا۔ کمزوری اور بیماری اپنی جگہ مگر سب سے بڑی وجہ ماں اور بچے کو خوراک کا نہ ملنا تھا۔ فضلو گاؤں کے زمیندار جسے سب وڈیرہ سائیں کے نام سے جانتے تھے کے پاس ایک معمولی ہاری کی ملازمت کرتا تھا، تنخواہ وغیرہ تو کچھ نہیں بس ڈیرے سے کچھ اناج اور سال میں دو مرتبہ پرانے کپڑے مل جاتے تھے جو فضلو کی کل کمائی تھی ، وڈیرہ سائیں کبھی خوش ہو کر کچھ پیسے دے دیں تو ان کی مرضی لیکن ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔

دن بھر وڈیرہ سائیں کے کھیتوں اور مویشیوں کی دیکھ بھال اور ان کی ایک آدھ جھوٹی تعریف فضلو کی زندگی کا واحد مقصد تھا۔

آج فضلو کی پریشانی کا سبب متوقع ولادت تھی کیونکہ نہ تو گھر میں کھانے کو کچھ تھا، نہ ہی نومولود کو ڈھانپنے کے لیے کوئی کپڑا، نہ ہی دوا کا انتظام نہ ہی دائی یا ڈاکٹر کی دستیابی کہ مفت میں اس دوپہر میں کون آئے؟

چچا فضلو ایک گھر سے دوسرے گھر اس آس پہ جا رہا تھا کہ شاید کوئی مالی مدد میسر ہو جائے مگر گاؤں میں تو سب کا حال ہی ایک جیسا تھا۔ وڈیرہ سائیں شہر گیا ہوا تھا اور ڈیرے میں بیٹھے اس کے چیلوں سے کچھ مانگنے یا الجھنے کا سوچ کر ہی چچا فضلو کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

خیر اس کشمکش اور سوچوں کی اُدھم پیل میں فضلو کو پڑوس کی عورتوں سے [جو گھر میں آئی ہوئی تھیں] ایک بیٹے کی نوید ملی۔ فضلو بے چارہ اس سوچ میں کہ اب آگے کیا ہوگا صرف ایک مصنوعی ہنسی ہی چہرے پر لا سکا۔

اور کچھ سمجھ نہ آیا تو چچا فضلو گاؤں کی اکلوتی مسجد کے مولوی صاحب کے پاس چلا گیا اور عرض

کی ''مولوی صاحب! آج گھر میں بیٹے کی پیدائش ہوئی ہے کوئی بھلا سا نام بتا دیں رکھنے کو، مگر نام ایسا ہو کہ بچہ بچ جائے کہ چار اس سے پہلے کے جلدی ہی مر گئے۔''

یہ کہ کر فضلو فرط عقیدت سے مولوی صاحب کے ہاتھ آنکھوں پر لگا کر چومنے لگا۔

مولوی صاحب گویا ہوئے:

''فضلو دیکھ ایسی خبر بغیر مٹھائی کے نہ لایا کر اور اب تو تیرے بچے کی زندگی کے لیے دعا بھی مانگنی پڑے گی، کوئی تعویز اور چلّہ بھی لگانا ہوگا، تو تیری غربت اور اخلاص کو دیکھتے ہوئے پچاس روپے میں یہ کام ہو جاوے گا، جا شاباش بھاگ کے مٹھائی اور پیسے لے آ، تب تک میں کوئی موزوں نام سوچ لوں حساب کتاب لگا کے۔''

فضلو نے روہانسی لہجے میں جواب دیا، مولوی صاحب! میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں، سائیں شہر گیا ہوا ہے بس نام بتا دو، اللہ بھلا کرے گا مگر مولوی صاحب پر اس کا کوئی اثر نہ ہونا تھا نہ ہوا، کہنے لگے تو جب تک بیٹے کو ''بے نام'' ہی رکھ، شاید دنیا میں اور دین میں بھی بے نام ہی رہ جائے اتنا کہ کر مولوی صاحب منہ پھیر کر تسبیح کرنے لگے! اور فضلو بیچارہ کچھ دیر تک تو انکی ہزار دانوں کی تسبیح ختم ہونے کے انتظار میں بیٹھا رہا پھر مایوس ہو کر واپس چلا آیا۔

''بے نام'' اور مولوی صاحب کے جملے فضلو کے دل کے آر پار ہو گئے۔ اس رات فضلو سو نہیں پایا، بس روتا رہا اور اپنے صحن کی چارپائی پہ پڑا پتہ نہیں آسمان کو تکتے ہوئے کیا کیا بڑبڑاتا رہا۔

''اللہ سائیں! یہ مولوی صاحب کہتے ہیں میرا بیٹا بے نام رہ جائے گا او میرے نام والے اللہ، میری لاج رکھ، اسے زندگی دے، نام دے، اس کا خیال رکھ، ہم پر رحم کر، ہم پر فضل کر، میرے مالک آج یہ بے نام تیرے نام کرتا ہوں۔''

تجھ سے تو شکوہ نہیں لیکن خدائے کائنات
تیرے بندے کو دیئے دکھ تیری دنیا نے بہت

جیسے تیسے دن گذرتے گئے، دن ہفتے، ہفتے مہینے اور مہینے سال بنتے چلے گئے فضلو دن رات

سائیں کی سیوا کرتا اور کچھ وقت مل جاتا تو اس میں اپنے بیٹے سے کھیلتا۔
آج اس کا بیٹا لگ بھگ آٹھ سال کا ہو گیا تھا۔ نام کچھ نہیں رکھا تھا، کوئی چھوٹا بولتا، کوئی فضلو کا فضلو تو کوئی مُنّا۔
مُنّے نے دو سال کی عمر میں ہی بولنا سیکھ لیا تھا اور دماغ کا بہت تیز تھا اس میں عام بچوں والی کوئی بات نہیں تھی نہ زیادہ بولتا تھا نہ کھیلنے سے کوئی دلچسپی، نہ کھلونوں کا کوئی شوق نہ کھانوں سے رغبت، دے دیا تو کھا لیا ورنہ مانگا کبھی نہیں۔
فضلو اپنے مُنّے کو وڈیرہ سائیں کے پاس اکثر لے جایا کرتا تا کہ ان کی سرپرستی رہے مُنّا جب بھی سائیں سے ملتا بہت سوال پوچھا کرتا تھا اور سوالوں کی یہ تکرار نہ تو فضلو کو بھلی لگتی اور نہ ہی سائیں کو، کبھی کبھار سرزنش تو کبھی ڈانٹ تو کبھی مار، یہ مُنّے اور سائیں کے درمیان روز کی بات ہو گئی۔
ایک دن فضلو بجلی نہ ہونے کے سبب آدھی رات کو بیٹھا اپنی بیوی کے ساتھ اپنے نصیب کا ماتم کر رہا تھا کہ مُنّا اٹھ گیا اور کہنے لگا:
بابا! آپ جلی کٹی کیوں بولتے رہتے ہو؟
منّے میں دکھی جو رہتا ہوں۔
یہ دکھ کیا ہوتے ہیں؟
بیٹا! دکھ ایسی چیز ہے جو صرف غریبوں کے پاس ہوتے ہیں۔
تو یہ دیتا کون ہے؟
امیر۔
کیوں؟
انہیں خوشی ملتی ہے شاید دکھ دے کر غریبوں کو۔
تو امیروں کو دکھ کون دیتا ہے؟

پتہ نہیں، تو بکواس بند کر اور سو جا۔
بابا! تو خوشی کیا ہوتی ہے؟ کیسی دکھتی ہے؟
جو امیروں کے چہروں پر ہوتی ہے جب وہ مسکرا رہے ہوتے ہیں
تو پودوں کی خوشی کیسے ہوتی ہے اور جانوروں کی؟
بیٹا جانوروں کی خوشی ان کے اچھلنے کودنے میں ہے اور پودوں کی خوشی ان کے پھولوں میں۔
پھر بابا! ہم پھولوں کو توڑ کیوں لیتے ہیں؟
فضلو نے ہمیشہ کی طرح منہ بگاڑا اور کروٹ بدل کے سو گیا۔ صرف فضلو ہی نہیں پورا گاؤں مُنّے کے روز روز کے سوالوں سے تنگ تھا۔
پنچائیت کے بڑے بوڑھوں نے تو صاف منع کر دیا تھا کہ دیکھ فضلو! تو جب ملنے آوے تو اس شیطان کو ساتھ نہ لایا کر یہ اول فول بکتا ہے اور ہمارا وقت برباد کرتا ہے۔
مسجد کے مولوی صاحب کو تو مُنّے سے جیسے اللہ واسطے کا بیر تھا، شاید وہ اپنی مٹھائی کا غم بھول نہیں پائے تھے یا مُنّے کے ہر وقت کے سوالات نے ان کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔
اگر مُنّے کی گاؤں بھر میں کسی سے دوستی تھی تو وہ تھے دینو چاچا۔ نام تو ان کا دین محمد تھا مگر سب لوگ انہیں دینو چاچا کہہ کر بلاتے تھے۔ کوئی ساٹھ کے پھیرے میں ہوں گے یا شاید پچپن کے، آگے پیچھے کوئی تھا نہیں، کچھ سال پہلے پتہ نہیں کہاں سے اس گاؤں میں آئے اور یہیں کے ہو رہے، کبھی موچی کا ٹھیّہ لگا لیتے تو کبھی آم بیچتے نظر آتے، کبھی حجام بن جاتے تو کبھی سبزی فروش، ایک بے ضرر سے بزرگ آدمی تھے، کم گو تھے لہٰذا لوگ زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے۔
مُنّے کو جب بھی وقت ملتا گھر اور ڈیرے کے بے شمار چھوٹے چھوٹے کاموں سے، تو وہ چاچا دینو کے پاس جا بیٹھتا۔
آج دینو چاچا گاؤں سے ذرا ہٹ کے کنویں کے پاس بیٹھا اپنے روایتی طرز پر خلاؤں میں کھویا ہوا تھا کہ مُنّا آ گیا۔

دینو چاچا، دینو چاچا، میری بات سن، سن بھی لے نا۔
ہاں کیا ہے مُنّے کیوں تنگ کرتا ہے؟
چاچا تو یہ روز نویں [نئے] کام کیوں کرتا ہے، کوئی ایک کام کرلیا کر ٹِک کے؟
چاچا نے مُنّے کو گھورا کیونکہ سوال اُس کی عمر سے بڑا تھا، اور بولا دیکھ مُنّے! یہ جو روٹی روزی ہوتی ہے نا وہ اللہ دیتا ہے، یہ کام کاج تو وسیلہ بہانہ ہوتے ہیں جب کسی کام میں میرا ہاتھ بیٹھ جاتا ہے اور دل میں خیال آنے لگتا ہے کہ میں اب خود کما کے کھا سکتا ہوں اور میرا جو رشتہ ہے اپنے اللہ سے وہ ٹوٹنے لگتا ہے تو میں کام چھوڑ دیتا ہوں۔
او چاچا! کیا بول رہا ہے کچھ سمجھ نہ آوے ہے چل چھوڑ یہ بتا میرا نام کیا ہے؟
سب مجھے مُنّا کہتے ہیں اب میں کوئی مُنّا تھوڑا ہی ہوں؟
آٹھ سال کا جوان ہوگیا ہوں، کام کاج میں ہاتھ بٹاتا ہوں بابا کا، تو میرا بھی نام ہونا چاہئے اور چاچا میں کون ہوں؟
مُنّے ہم سب اللہ کے بندے ہیں میں بھی اور تو بھی، تو اپنا نام ''عبداللہ'' رکھ لے یہ سن کر مُنّے کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور فوراً چیختا ہوا بھاگا میں عبداللہ ہوں میں عبداللہ ہوں میرا نام ہے عبداللہ۔
گھر پہنچ کے جب یہ نام ماں اور باپ کو بتایا تو انہیں غلطی کا احساس ہوا کہ نام تو وہ رکھنا ہی بھول گئے بہت چاہا کہ مُنّے کا نام وڈیرہ سائیں سے رکھوائیں شاید اس بہانے کوئی طاقتور سہارا مل جاوے اور گاؤں کی رِیت بھی یہی ہے۔ مگر مُنّے کو تو عبداللہ کا بھوت ایسا چڑھا کہ ماں باپ کو ہار مانتے ہی بنی اور یوں فضلو کا منا عبداللہ قرار پایا۔

☆☆☆

آج صبح ہی سے عبداللہ بے حال تھا، رات کھانے کو کچھ ملا نہیں، فضلو اور ماں دونوں ڈیرے پر کام کرنے جاتے تو وہاں سے کھانا کھا کر آتے اور چھوٹے عبداللہ کے لیے لے آتے ۔کل نہ تو عبداللہ ڈیرے پر گیا اور نہ ہی ماں باپ کچھ لا سکے، رات کی بھوک اور غصہ عبداللہ کے چہرے سے ہی نظر آ رہا تھا۔

خیر وہ آج ڈیرے پر کام کرنے کے لیے چلا گیا، صحن میں ہی وڈیرہ سائیں اپنے چیلوں اور پالتو کتوں کے ساتھ براجمان تھے، عبداللہ نے جا کر سلام کیا اور پیروں کو ہاتھ لگایا۔

وڈیرہ سائیں گویا ہوئے اوئے چھوٹے ، کیا نام بتایا تھا فضلو نے تیرا، ہاں عبداللہ تو جلدی سے ایسا کر کہ رسوئی سے گوشت لا کے میرے ان شیروں [کتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے] کو کھلا دے پھر ذرا ان کو چہل قدمی کرا کر انہیں اچھی طرح نہلا دے بے چارے کل شکار پر گئے تھے تھکے ہوئے ہوں گے۔

عبداللہ ایک معمول کی طرح اٹھا اور بتائے ہوئے کاموں پر لگ گیا مگر سوالوں کی ایک بوچھاڑ تھی جو ذہن پر بوجھ بنے جا رہی تھی ، باپ نے سختی سے ڈیرے اور خصوصاً وڈیرہ سائیں سے کچھ پوچھنے کا منع کیا تھا مگر عبداللہ کا ذہن تو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

کیوں تھکا ہوا تو میں بھی ہوں، میں نے تو کھانا بھی نہیں کھایا، گوشت تو دور کی بات ، باسی روٹی بھی نہیں ملی ، کیا امیر کے کتے ،غریب کے بچوں سے زیادہ اہم اور خیال رکھے جانے کے قابل ہوتے ہیں؟ کیا سائیں کو ہماری حالت نظر نہیں آتی ؟

کیا سائیں کا اور میرا اللہ اور ہے؟ اور نجانے کیا کیا۔

خیر عبداللہ جیسے ہی کتوں کے کام کاج سے فارغ ہوا سیدھا وڈیرہ سائیں کی خدمت میں گیا اور کہا:

سائیں ایک بات پوچھوں اگر ناراض نہ ہوں تو؟

ہاں عبداللہ ویسے تو تیرا بولنا ہمیں سخت ناپسند ہے مگر آج موڈ بہت اچھا ہے تو پوچھ لے کیا پوچھتا ہے؟

سائیں میں کون ہوں؟
ابے تو میرا نوکر ہے اور کون۔
اچھا تو میرا باپ کون ہے؟
وہ بھی میرا نوکر ہے [سائیں مسکراتے ہوئے]
اور میرا دادا وہ کون تھا؟
وہ بھی میرا نوکر تھا [سائیں کے لہجے میں رعونت اور غرور جیسے بھر آیا ہو]
اچھا مگر سائیں ایک بات سمجھ نہ آئی، ہم نسلوں سے نوکر چلے آرہے ہیں اور آپ نسلوں سے مالک۔
ہاں یہ تو ہے [سائیں مسکراتے ہوئے بولا۔]
تو [عبداللہ نے اپنی بات جاری رکھی] پھر آپ کے کسی بھی کام، کاروبار، ڈھور ڈنگر، یا کھیتی کا اثر آپ کے پاس کے لوگوں پر کیوں نہیں ہوتا؟
ہم ڈاکٹر، انجینئر بھلے نہ بنیں، مگر اس قابل تو ہو جاویں کہ دو وقت کی روٹی نصیب ہو سکے۔ عبداللہ کی بات کی چبھن اور نظروں کا زہر وڈیرہ سائیں کو اپنی نسوں میں سرایت کرتا محسوس ہوا وہ سیخ پا ہو گیا اور طیش میں آ کے اپنے نوکروں کو آواز دی۔
اوّئے کرمو! ارئے صابو اوئے گڈّے۔ ادھر آ۔ ماراس پلے کو، حرامی باتیں بناتا ہے۔
اور سب کے سب عبداللہ پر ٹوٹ پڑے، اندر زنان خانے میں سے کسی نے چھ آدمیوں کو ایک آٹھ سالہ لڑکے کو پیٹتے دیکھا تو عبداللہ کے باپ کو خبر کر دی۔
فضلو بے چارہ کپکپاتا ہوا آیا اور سائیں کے پاؤں پڑ گیا۔
''معاف کردے سائیں پگلا گیا ہے گرمی میں، بے وقوف ہے، جاہل ہے، معاف کردے سائیں بچہ ہے۔''
لاتوں، مکوں اور تھپڑوں کی زد میں جب عبداللہ کے کپڑے پھٹ گئے اور چہرہ لہولہان ہو گیا تب کہیں جا کے سائیں کی انا کو تسکین پہنچی کہنے لگا ''اوئے فضلو! لے جا اسے، لیکن آئندہ ڈیرے

پر اگر یہ نظر آیا تو کٹوا کے کُتّوں کو کھلا دوں گا''۔
فضلو اپنے لختِ جگر کو نیم بے ہوشی کی حالت میں لے کر گھر پہنچا تو بیوی نے رو رو کر جان ہلکان کر دی ۔مگر تعجب کی بات ہے کہ عبداللہ کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی شوخی مزید بڑھ گئی تھی۔
درد، تکلیف ،ہونٹوں پر بہتے خون کا ذائقہ ، پھٹے کپڑوں سے جھانکتا لاغر جسم اور سُوجی ہوئی آنکھیں، آج عبداللہ کا ظاہر اس کے باطن کا نظارہ پیش کر رہا تھا، وہ پوری رات درد میں کمی پر سوتا اور شدت پر اٹھتا رہا۔
فضلو کو تو جیسے آج کسی نے اندر سے ہی توڑ ڈالا ہو، اپنے سامنے اپنے لختِ جگر کو پٹتا دیکھتا رہا اور اتنی جرأت بھی نہیں کہ اٹھ کے بچا ہی سکے، کوئی ہاتھ ہی روک لے ۔آج پھر فضلو رات بھر کھلے آسمان کے نیچے بیٹھا اپنے اللہ سے نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔

☆☆☆

خلاف توقع صبح عبداللہ اٹھا تو اس کا موڈ کافی خوشگوار تھا، جسم پر چوٹوں کے نشان مگر چہرے پر وہی ازلی مسکراہٹ جو اس کی شخصیت کا حصہ تھی ۔ماں نے جلدی سے گرم گرم پراٹھا سامنے رکھ دیا اور باپ کی قمیص سے بنائی گئی قمیص بھی رکھ دی۔
عبداللہ ماں سے، اماں یہ روٹی کہاں سے آئی ؟
تو کھالے چپ کر کے کل کا بھوکا ہے۔
سائیں کے ڈیرے سے آٹا لائی ہے نا؟
تو کھاتا ہے کہ نہیں؟ ماں نے بڑی مشکل سے آنسو روکتے ہوئے کہا۔
عبداللہ کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر ماں کے غم کو دیکھتے ہوئے روٹی کھائی اور قمیص پہن کر باہر نکل گیا۔
عبداللہ جلد از جلد چاچا دینو کے پاس پہنچ کر اپنے دل کا غم ہلکا کرنا چاہتا تھا چاچا دینو نے عبداللہ کی شکل دیکھی تو مسکرانے لگا عبداللہ کو تو جیسے آگ ہی لگ گئی۔

اوئے چاچا کیسا دوست ہے میرے پھینٹی پڑی اور تو ہنس رہا ہے؟
عبداللہ یہ تو سینک ہو رہی ہے کُندن کی۔
چاچا یہ موٹی موٹی باتیں کر کے دل نہ جلا، مجھے کچھ پوچھنا ہے؟
ہاں پوچھ؟
چاچا میں کیا کروں گا، میری جندگی تو ختم ہوگئی، ڈیرے پہ جانے پر پابندی لگ گئی۔ تجھے پتہ ہے نا کل کیا ہوا ہے؟
ہاں، ہاں عبداللہ پورے گاؤں کو پتہ ہے۔
تو کیا اللہ کو بھی پتہ ہوگا؟
ہاں بیٹا! وہ تو مالکِ کل ہے سب دیکھتا، سب سنتا ہے۔
تو پھر وہ مجھے بچانے کیوں نہیں آیا؟
سائیں کے بندے آ گئے تھے نا مارنے، تُو تو کہتا ہے میں اللہ کا بندہ ہوں تو وہ کیوں نہیں آیا بچانے کو؟
بیٹا ہر کام میں اللہ کی مصلحت ہووے ہے شاید تیرا ڈیرے پہ کام کرنا اسے منظور نہ ہو۔
چل تو چھوڑ اسے، آ نماز پڑھ لیں مسجد جا کر ظہر ہونے والی ہے۔ ظہر پڑھ کے چاچا دینو سبزی کی ریڑھی لے کر گاؤں کے بس اسٹینڈ پر کھڑا ہو گیا اور عبداللہ اس کے ساتھ ساتھ۔
چاچا ہم نماز کیوں پڑھتے ہیں؟
تا کہ اللہ پاک خوش ہو جاویں۔
اگر ہمیں نماز پڑھ کر خوشی نہ ہووے تو بھی اللہ پاک خوش ہو جاویں گے؟
چاچا دینو دیر تک عبداللہ کو دیکھتا رہا مگر جواب کچھ نہ دیا۔
اسی طرح باتوں باتوں میں دن ڈھل گیا، چاند سامنے آیا تو دونوں نے گھر کی راہ لی۔
چاچا نے جاتے ہوئے کہا عبداللہ دیکھ چاند اور اس کی چاندنی کتنی پیاری ہے؟

چھوڑ چاچا ابھی تو بھوک لگی ہے جب پیٹ خالی ہونا تو چاندنی واندنی کچھ اچھا نہ لگے ہے۔

چاند سے پیاری ہیں مجھ کو بھوک میں دو روٹیاں
جب کوئی بچہ مرے گا کیا کرے گی چاندنی؟

☆☆☆

فضلو کئی ہفتوں سے سوچ رہا تھا کہ عبداللہ کا مستقبل کیا ہوگا؟

کئی بار خیال آیا کہ سائیں سے پھر معافی مانگ کے عبداللہ کو ڈیرے پہ لے آؤں کہ غریب لوگوں کا واحد آسرا یہ ڈیرہ ہی تو تھا، مگر سائیں کے غصے اور عبداللہ کی سوال کرنے کی مستقل عادت کے ڈر سے چپ ہو رہا۔

آج برابر والے گاؤں سے ڈیرے پر کچھ مہمان آئے ہوئے تھے ان میں کچھ بچے بھی تھے جنہوں نے پیلی شلوار قمیص کی اسکول یونیفارم پہنی ہوئی تھی یہ دیکھتے ہی فضلو کے دل میں بھی امید جاگی کہ وہ عبداللہ کو اسکول میں داخل کروا دے۔ اس طرح شاید اسے زندگی میں کوئی کام بھی مل سکے اور اس کا وقت بھی برباد نہ ہو۔

اگلی صبح فضلو نے عبداللہ کو تیار کیا اور گاؤں کے واحد اسکول کی طرف چل پڑا، اسکول پہنچا تو دیکھا کہ تین میں سے دو کمروں میں گائے اور بھینس بندھی ہوئی تھیں، عبداللہ سے پھر نہ رہا گیا بول پڑا:

استاد جی! کیا ڈھور ڈنگر بھی پڑھنے آتے ہیں؟

ابے نہیں! یہ وڈیرہ سائیں کے ہیں پھر استاد جی فضلو سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ فضلو! وڈیرہ سائیں سے اجازت لے آ، ان کی اجازت کے بغیر یہاں کوئی داخلہ نہیں لے سکتا۔

''مگر اسکول تو سرکاری ہے'' فضلو نے احتجاجاً کہا۔ ''اور سرکار سائیں کی ہی تو ہے''، استاد جی نے لقمہ لگایا۔

عبداللہ نے پھر سے ٹانگ اڑائی، تو استاد جی! کتنے بچے پڑھ رہے ہیں اسکول میں؟

صرف دو، وہ دونوں میرے بیٹے ہیں، باقی سائیں نے کسی کو اجازت نہیں دی۔

تو سائیں کے بچے؟

ابے پگلے! وہ شہر کے بڑے اسکولوں میں ہوں گے وہ کوئی غریبوں کے اسکولو ں میں تھوڑا ہی آئیں گے۔

کچھ دیر کی مزید بحثِ لا حاصل کے بعد فضلو اور عبداللہ واپس گھر کی طرف چلے گئے فضلو نے عبداللہ کا دل بڑا کرتے ہوئے کہا تو فکر نہ کر پاس والے گاؤں میں داخلہ کرادوں گا تو روز گاڑی میں چلے جانا بس اڈے سے ،ڈرائیور میرا جاننے والا ہے وہ کرایہ نہیں لے گا میں شام کو اس کی گاڑ ی دھو دِیا کروں گا۔

کچھ دنوں کے بعد سائیں شہر گیا تو فضلو چپکے سے برابر والے گاؤں چلا گیا اسکول پتہ کرنے کو۔

عبداللہ پورا دن اسی کا انتظار کرتا رہا، فضلو آیا اور کہا کہ وہاں داخلہ نہیں ملا اور سو گیا، عبداللہ کو کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا ہوا مگر پوچھے تو پوچھے کیا؟

رات کے پچھلے پہر عبداللہ کی آنکھ کھلی تو ابا کو اماں سے کہتے سنا، ارے نیک بخت !وہاں اسکول میں بچوں سے کام کرواتے ہیں ان سے غلط حرکت وغیرہ بھی کرتے ہیں پورے گاؤں میں یہ بات مشہور ہے ہمارا عبداللہ تو ویسے بھی بڑا کمزور ہے کہ شور بھی نہیں کر سکے گا۔

اس کے نصیب میں نہیں ہے اسکول تو پریشان نہ ہو، اللہ کوئی سبیل کرے تو کرے بظاہر تو کچھ سُجھائی نہیں دیتا۔ پتہ نہیں کب کوئی آنسو عبداللہ کی آنکھ سے نکلا اور تہہ خاک ہوا۔

اِک آہ کرکے تُو نے اللہ رے قلبِ سوزاں
دُنیا ہِلا کے رکھ دی فریادِ مختصر سے

☆☆☆☆☆

آج فضلو پھر مسجد میں انہی مولوی صاحب کی منت سماجت کر رہا تھا کہ عبداللہ کو مسجد میں قرآن و نماز پڑھا دیں اور مدرسے میں داخلہ دے دیں۔

دیکھ فضلو! تیرے بچے کے کرتوت اور شہرت کوئی اچھی نہیں ہے گاؤں بھر میں، اوپر سے وڈیرہ سائیں ناراض ہوگئے تو چندہ بھی نہیں ملے گا تو اگر وعدہ کر کہ تیرا لال سوال نہیں پوچھے گا اور روز مسجد اور مدرسے کی جھاڑو پونچھا کرے گا تو کل سے بھیج دے۔

اور یوں کچھ گھنٹوں کی غلامی اور سوال نہ کرنے کی شرط پر عبداللہ کا داخلہ ہوگیا۔

عبداللہ مسجد میں پڑھائی کی منازل بہت تیزی سے طے کرتا چلا گیا صبح فجر کے بعد ہی آجاتا اور مغرب کے بعد گھر جاتا جب کہ معمول کے اوقات صبح سورج نکلنے سے لیکر ظہر کی نماز تک تھے۔

کھانا بھی مدرسے میں کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا، نورانی قاعدہ، یسرنا القرآن، ناظرہ، تجوید سب کچھ عبداللہ نے 2 سال کے عرصے میں مکمل کر لیا لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا، حافظ اس کمال کا کہ سال سال پہلے کی باتیں یوں ازبر ہوتیں جیسے کل کی بات ہو۔

دو سال میں معمولی نوک جھونک کے علاوہ ابھی تک کوئی بڑا مسئلہ نہ ہوا تھا۔

ایک دن مولوی صاحب نے عبداللہ کو ''مولوی'' بننے کا مشورہ دیا۔

مولوی صاحب ''مولوی'' کسے کہتے ہیں؟

بھئی وہ شخص جو انسانوں کو اللہ کا راستہ دکھائے وہ مولوی ہوتا ہے۔

تو مولوی کو راستہ کون دکھاتا ہے؟

اسے دین کا علم راستہ دکھاتا ہے۔

تو لوگ دین کا علم حاصل کر لیں مولوی کی ضرورت کیا ہے؟

لوگوں میں اتنی عقل نہیں ہوتی۔

تو مولوی کے پاس کہاں سے آئی؟

مولوی کو اللہ دیتا ہے۔
تو لوگوں کو کیوں نہیں دیتا؟
اور اس گفتگو کے بعد مولوی صاحب نے عبداللہ کو ''مولوی'' بنانے اور عبداللہ نے ''مولوی'' بننے کا خیال دل سے نکال دیا۔
مدرسے وہ اب بھی جاتا تھا ایک استاد سے حدیث اور فقہ پڑھنے، مگر اب اس کے سوالوں کا سلسلہ دراز ہوتا جا رہا تھا۔

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ [سورۃ الذاریٰت ۵۱:۵۶]

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں۔''

آج کی کلاس مولوی صاحب نے اس جملے سے شروع کی، پوری جماعت نے اقرار میں سر ہلایا مگر عبداللہ کو بھلا ''آسان باتیں'' کب سمجھ آتی تھیں مولوی صاحب سمجھ نہیں آیا۔
مولوی صاحب نے غصے میں عبداللہ کو دیکھا اور عربی اور اردو میں آیت اور اس کا ترجمہ پھر بیان کر دیا۔
مولوی صاحب بات نہیں بنی عبداللہ پھر گویا ہوا۔
اب مولوی صاحب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا انہوں نے چیخ کے کہا بد بخت سب بچوں کو سمجھ آ گیا، تیرا دماغ ہے یا بھوسا تجھے کیا مسئلہ ہے جو اتنی آسان بات پلے نہیں پڑتی۔
مولوی صاحب، فرشتے موجود ہیں نا، کوئی چوبیس گھنٹے رکوع میں تو کوئی سجدے میں، کوئی حمد و ثنا کے لیے تو کوئی طواف میں مگن، تو اللہ کو میری ''عبادت'' کیوں چاہیئے؟
آخر ''میری عبادت'' فرشتوں کی عبادت سے کیسے مختلف ہوئی؟
چپ کر، بد بخت ہر بات پہ سوال نہ پوچھا کر اللہ کا کلام ہے اور تو مسجد میں بیٹھا ہے۔
مگر اللہ سائیں نے یہ کلام ہمارے واسطے بھیجا ہے اگر میں سمجھوں گا نہیں تو عمل کیسے کروں گا مجھے فرق سمجھا دیں ورنہ میں تو نہیں پڑھتا نماز۔

کیا ضروری ہے کہ فتنۂ محشر بھی بنوں
وجۂ تخلیقِ جہاں ہوں یہ سزا کافی ہے

عبداللہ کے یہ الفاظ پوری کلاس میں بجلی بن کے گرے مولوی صاحب نے اس ''کفر'' کی پاداش میں ارتداد کا فتویٰ لگایا اور خبر گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

فضلو بھاگتا ہوا آیا، ایک خلقت جمع ہوگئی، چاچا دینو کو بھی خبر کر دی کسی نے، سمجھا بجھا کے عبداللہ سے کہا معافی مانگ مگر عبداللہ نہ تو معافی مانگے نہ نماز پڑھے۔

خیر لوگوں کے سمجھانے پر مولوی صاحب نے عبداللہ کو کلمۂ توحید پڑھا کے پھر سے مسلمان کیا اور فضلو سے مٹھائی کا مطالبہ۔

''مسلمان'' ہونے کے بعد عبداللہ نے مولوی صاحب سے کہا، مولوی صاحب! وہ سوال کا جواب تو دے دیں۔

ابے عقل کے دشمن، اسی سوال کی وجہ سے تو سارا جھگڑا ہوا ہے تجھے ایمان عزیز ہے کہ نہیں؟

پر وہ سوال تو وہیں کا وہی رہا نہ؟

لے جا فضلوا سے، آجائیں وڈیرہ سائیں شہر سے واپس، اس گاؤں میں یہ ''کافر'' رہے گا یا میں۔

عبداللہ پہ تو مولوی صاحب کی بات کا کچھ اثر نہ ہوا مگر فضلو کی جان نکلی جا رہی تھی، عبداللہ بمشکل 11 سال کا ہوگا مگر اس کے مسئلے پورے گاؤں کے برابر تھے گھر پہنچتے ہی فضلو نے کہا!

عبداللہ، آج تو مولوی بھی تیرا دشمن ہو گیا سائیں پہلے ہی تجھ سے خار کھاتا ہے، نہ دنیا سے یاری نہ دین سے، دونوں ہی دشمن ہو گئے، تیرا کیا ہوگا؟

ابا تو مجھے زہر لا دے تیری بھی جان چھوٹے اور میری بھی۔

اتنے میں دروازے کے باہر کسی نے آواز لگائی۔ آنے والا چاچا دینو تھا چاچا دینو نے معاملے کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے بات کا رخ موڑا۔

عبداللہ تجھے بلی پسند ہے؟ ہاں! چاچا بہت پسند ہے اچھلتی کودتی قلابازیاں کھاتی، قلقاریاں بھرتی

،اپنی دنیا میں مگن۔
کیا وہ اپنے کسی بھی کام میں اللہ کی نافرمانی کرتی ہے؟
نہیں چاچا، وہ کر ہی نہیں سکتی، اس کے پاس اتنا دماغ تھوڑا ہی ہوتا ہے۔
اور فرشتے، کیا وہ گناہ کر سکتے ہیں؟
اُم م م م، نہیں چاچا ان کے پاس گناہ کا جذبہ نہیں ہوتا۔
تو عبداللہ یہی تو وہ من مرضی ہے جس کی وجہ سے اِنسان ممتاز ٹھہرا اور اسی من مرضی کی وجہ سے پکڑ ہوگی۔
عبداللہ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا مگر فضلو کی پریشانی تو کچھ اور تھی۔
آخر کار فضلو نے عبداللہ کی ماں کے ساتھ مل کر ایک فیصلہ کر ہی لیا اور وہ تھا عبداللہ کو اپنی بہن کے پاس پنجاب بھیجنے کا۔
فضلو کی بہن کی شادی پنجاب کے ایک دیہاتی گھرانے میں ہوئی تھی، امیر تو وہ بھی نہ تھے مگر کم از کم ہاری نہ تھے، زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا اس کے شوہر کا اِس پہ کام کرتے تھے اور اولاد کوئی تھی نہیں۔
اور یوں صبح سویرے پَو پھٹنے سے پہلے عبداللہ دکھی دل اور روتی آنکھوں کے ساتھ اپنے ماں، باپ اور دینو چاچا کو خدا حافظ کہہ کر روانہ ہو گیا۔

اشک نکلے ہیں تعاقب کا بہانہ کر کے
کوئی گھر میں نہ رہا تم کو روانہ کر کے

☆☆☆☆☆

عبداللہ اپنی پھوپھی سے مل کر بہت خوش ہوا، صرف دو بندے ہی تو تھے گھر میں، اور عبداللہ یوں بھی تنہائی پسند تھا۔

کچھ ہی دنوں میں پھوپھی نے عبداللہ کا ''نئی روشنی'' نامی سرکاری اسکول میں داخلہ کرادیا۔ پیلی یونیفارم عبداللہ کو بہت پسند آئی۔

عمر کے اعتبار سے یوں تو عبداللہ کو پانچویں کلاس میں ہونا تھا مگر اسے A,B,C,D نہیں آتی تھی لہٰذا 11 سال کی عمر میں اسے پہلی جماعت میں اپنی سے آدھی عمر کے بچوں کے ساتھ بیٹھنا پڑا۔

پورے اسکول میں ہیڈ ماسٹر کو چھوڑ کے فقط تین استاد اور تھے، نہ مکمل فرنیچر، نہ بجلی اور پانی بھی وہ جو گھوڑے گدھے سب ہی پیتے تھے۔

مگر عبداللہ کی پیاس تو علم سے ٹھیک ٹھاک بُجھ رہی تھی وہ جماعتیں تین، تین ماہ میں پھلانگتا چلا گیا اور صرف چودہ سال کی عمر میں نویں تک پہنچ گیا۔ اب بورڈ کے امتحانات ہونے والے تھے لہٰذا پورا سال پڑھنا تھا۔

سال کے شروع کے ہفتے میں ایک استاد نے عبداللہ کو بلایا اور نصیحت کی:

''بیٹا تو مجھے بڑا پسند ہے، تو ذہین ہے، اچھے سوال پوچھتا ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ ہم میں سے کسی کے پاس تیرے سارے سوالوں کے جواب بھی نہیں ہوتے، مگر دیکھ یہ بورڈ کے امتحان ہیں، یہاں پوزیشن کے لیے زبردست مقابلہ ہوتا ہے تو کوشش کر اگر کوئی پوزیشن تو نے اٹھالی بورڈ میں تو اس بہانے شاید ہمارے اسکول کے بھاگ کھل جائیں اور سرکار یہاں پر کوئی مناسب عمارت اور انتظامات کروادے۔ ہمیں بڑی امیدیں ہیں تجھ سے، اللہ تیرا حامی و ناصر ہو!۔''

عبداللہ ایک نئے عزم، ایک نئے جوش، ایک ولولے کے ساتھ اٹھا اور اس نے سوچ لیا کہ کوئی فائدہ نہیں زندگی کا اگر پوزیشن نہ آئی تو۔

گھر جا کے پھوپھی سے ذکر کیا تو وہ کچھ پریشان ہوگئیں، ایک تو اضافی کتابوں کا خرچ اور دوسرا وہ عبداللہ کی جذباتی طبیعت کو جانتی تھیں، انہیں لگا کہ اس لڑکے کی اگر پوزیشن نہ آئی تو کہیں کچھ کر نہ گزرے۔

اور یوں وہ بھی دن رات عبداللہ کے ساتھ لگ گئیں اس کی تیاری میں۔

ان چار سالوں میں عبداللہ صرف ایک بار ہی گاؤں جا سکا اپنے والدین سے ملنے، ماں ملاقات پہ اتنا روئی کہ آئندہ عبداللہ نے جانے کا ذکر ہی نہ کیا۔ وہ اکثر کہتا میں ایک دن ماں باپ کو اس دلدل سے نکال لاؤں گا۔

پھوپھی کو شاعری اور اردو سے بڑا لگاؤ تھا، انہوں نے عبداللہ کی اردو اور شاعری پر بڑی توجہ کی۔ اس کی پڑھائی کی رفتار بڑھانے کے لیے اسے روز کوئی نہ کوئی کتاب دے دیتیں [جو اکثر وہ ردّی والے سے کوڑیوں کے مول خرید لیتی تھیں]. پھوپھی اسے کہتی آج رات کا کھانا جب ملے گا جب یہ کتاب ختم ہوگی۔

پروین شاکر، فیض احمد فیض، اکبرالہٰ آبادی، چودھری فضلِ حق ،نسیم حجازی سے لے کر عمران سریز، مظہر کلیم، ابوالاثر حفیظ جالندھری، علامہ اقبال، سعدی و رومی، کوئی مصنف بچا نہیں تھا جس کی کتاب عبداللہ نے پڑھی نہ ہو۔ اور حافظے کا کمال یہ کہ چھ ہزار سے اوپر شعر یاد کر چکا تھا۔

اسی سال ڈویژن میں ہونے والے تقریری اور بیت بازی کے مقابلّوں میں اول پوزیشن حاصل کی۔ پوزیشن کے بعد عبداللہ اور اس کی پھوپھی کی خوشی دیدنی تھی۔

خیر پڑھتے پڑھتے عبداللہ کی نظر کمزور ہوگئی اور عینک لگ گئی مگر کتابوں کا جو شوق چڑھا وہ اُترنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ عبداللہ کے دوستوں کی تعداد صفر تھی کبھی کبھار چاچا دینو بہت یاد آتے تو اداس ہو جاتا اور انہیں خط لکھ دیتا جس کا وہ باقاعدگی سے جواب دیتے تھے۔

سرور عالم ہے کیفِ شراب سے بہتر
کوئی رفیق نہیں ہے کتاب سے بہتر

خیر وقت اپنی مقررہ رفتار سے گزرتا چلا گیا۔ آج اخبار میں میٹرک کے امتحان کا رزلٹ تھا عبداللہ نہ تو خود رات بھر سویا نہ کسی کو سونے دیا۔ شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو پورے محلے میں جو عبداللہ کے لیے دعا نہ کر رہا ہو۔ پھوپھی تو سرتاپا دعا ہی بن گئی تھیں۔

ہاتھ اٹھتے ہیں نہ ہوتی ہے لبوں کو جنبش
ہم تجھے اتنے سلیقے سے دعا دیتے ہیں

عبداللہ بھی رات بھر مُصلّے پہ بیٹھا روتا رہا۔

''اللہ سائیں! ساڈی وِی سن لے ساڈی لاج رکھ لے۔

مینو پوزیشن دے دے ۔فر تے نوکری لگ جاوے گی، تیرا وڈا شکر ہووے گا، دیکھ میرا باپ اور ماں خوش ہو جائیں گے اور پھوپھی تو شاید خوشی کے مارے جھومنے لگیں ۔ تجھے تیری شانِ کریمی کا واسطہ، شان حبیبی کا واسطہ، تو تو قریب ہے نا مجھ سے، شہ رگ سے بھی قریب، تو سن لے نا، نہ سنی ہو تو بھی سن، تجھے ہی تو سجدہ کرتا ہوں، تیرے علاوہ کوئی نہیں ہے تو جاؤں کہاں؟ بس سن لے میرے اللہ۔ اللہ سائیں میں تجھ ہی سے مانگتا ہوں، میرا باپ بھی تجھ سے مانگتا ہے، دادا بھی تجھ سے ہی مانگتا تھا، ہم تو نسلوں سے بھکاری چلے آرہے ہیں تیرے در کے، تو خالی ہاتھ واپس نہ بھیجیو میرے اللہ میاں

مجھے یقین ہے تو نے سن لی، دیکھ مجھے جھوٹا نہ کروایو!

اس رات کے اندھیرے میں تو جانتا ہے کہ میں نے جندگی میں صرف تجھ سے ہی تو مانگا ہے سن لے میرے مولا!۔

تجھے اس بات کا واسطہ کہ تو اللہ ہے، میرا اللہ ہے، او میرے اللہ سن۔''

پتہ نہیں کب عبداللہ کی آنکھ لگی، پھوپھی نے بھی نہ اٹھایا کہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ آنکھ کھلی جب گھر کے باہر شور اٹھا پورا اسکول ہی تو گھر میں آیا ہوا تھا اخبار ہاتھ میں لیئے۔

عبداللہ نے پورے ڈویژن میں سب سے زیادہ مارکس لیئے تھے ہر آنکھ خوشی میں اشکبار تھی۔ عبداللہ کو آج اپنی ماں باپ اور چاچا دینو بہت زیادہ یاد آرہے تھے۔ اور وہ یک دم ہی اُداس ہو گیا۔

عبداللہ اسی شام اخبار کی کاپی ہاتھ میں لیئے گاؤں روانہ ہو گیا اور پورے راستے سوچتا رہا کہ ابا کو کیسے بتائے گا۔ مولوی صاحب کو چڑائے گا جو اسے کوڑھ مغز کہتے تھے، گاؤں والوں کو دکھائے

گا جو سمجھتے تھے کہ اس کے دماغ میں بھوسا بھرا ہوا ہے۔

عبداللہ نے صبح سویرے گھر میں قدم رکھا تو ابا چارپائی پر پڑا کچھ سوچ رہا تھا اور ماں دیگچی میں چائے بنا رہی تھی۔

دیکھ ابا دیکھ۔ تیرے بیٹے نے کیا کیا ہے، پورے نمبر، سب سے زیادہ مارکس پورے ڈویژن میں، دیکھ اخبار میں بھی آیا ہے، اب میں بھی صاحب بن جاؤں گا بلے بلے۔ شاوا شاوا۔

باپ اور ماں اپنے بیٹے کے بوسے لیتے رہے اور روتے رہے۔ جذبات کا سمندر جب ٹھنڈا ہوا تو فضلو نے کہا۔

چل عبداللہ، سائیں کو دکھاتے ہیں اسے بھی تو پتہ چلے کہ میرے بیٹے نے کیا کیا ہے۔ اس نے تجھے گالی دے کے نکالا تھا نہ؟ چل آج اسے بتاتے ہیں۔

عبداللہ گویا ہوا:

چھوڑ دے ابا، مجھے پسند نہیں تیرا وڈیرہ، پھر کوئی ہنگامہ کرے گا مجھے ڈر لگتا ہے۔

ابے کچھ نہیں ہوگا، نوکروں کی خوشی میں مالک خوش ہوتے ہیں تو چل، آج میں سینہ تان کے کوئی بات کر سکوں گا۔ زندگی میں پہلی بار آج میں اس گاؤں کی زمین پر فخر سے چل سکوں گا۔ آج میں کپڑا کندھے پہ رکھ کے نہیں پگڑی بنا کے پہنوں گا تو چل۔

اور یوں عبداللہ چارونا چار ڈیرے کی طرف روانہ ہوا۔

ڈیرے پر پہنچے تو سائیں موجود تھا مگر موڈ کچھ خراب ہی معلوم ہو رہا تھا مگر فضلو تو اپنی ہی دھن میں مست تھا کہنے لگا:

''سائیں! یہ میرا لونڈہ آیا ہے آج پنجاب سے، اس کا آج میٹرک کا رزلٹ نکلا ہے۔''

اچھا کتنے پرچوں میں فیل ہوا ہے؟ سائیں نے مضحکہ خیز لہجے میں پوچھا۔ نہ سائیں ٹاپ کیا ہے پورے ضلع میں، یہ دیکھ اخبار میں نام آیا ہے سائیں آپ کا بیٹا بھی تو تھا شہر میں میٹرک کے امتحان میں، چھوٹے سائیں نے تو کمال ہی کر دیا ہوگا۔

یہ سنتے ہی سائیں کی آنکھ انگارہ ہوگئیں،ان کا بچہ 4 پرچوں میں فیل ہوگیا تھا کہنے لگا حرامخور مجاق اڑاتا ہے ،سن لیا ہوگا کسی سے،یہ تیرے پلے نے بتایا ہوگا اخبار پڑھ کے۔ٹھہر ذرا میں نکالتا ہوں تیرا گھمنڈ۔
فضلو کی تو جیسے روح ہی نکل گئی ،اس نے تو سوچا بھی نہ تھا ایسا ہوگا کہنے لگا ''نہ سائیں،ہم تو تیری ملکیت ہیں مجھے نہ پتہ تھا پیپرز میں غلطی ہوگئی ہوگی ،چھوٹا سائیں تو ملک میں سب سے ہشیار ہے مگر جو تیر کمان سے نکل گیا وہ واپس کہاں آتا ہے؟
سائیں نے اخبار پھاڑ کے فضلو کے منہ پر مارا اور لاتوں گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔
اب عبداللہ سے نہ رہا گیا،اس نے بھاگ کے سائیں کا ہاتھ پکڑ لیا،اور کہا سائیں معاف کر دے ہمیں کیا پتہ تھا تو چھوڑ دے میرے ابا کو سائیں غصے میں آپے سے باہر ہوگیا اور ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا،نہیں چھوڑتا حرامی کی اولاد،کیا کرے گا۔
عبداللہ کیا کہتا صرف اتنا کہا کہ ''اللہ پوچھے گا۔''
بس پھر کیا تھا فضلو کی پٹائی ختم اور عبداللہ کی شروع۔
جب سائیں اور اس کے نوکروں نے مار مار کے باپ بیٹے کو ادھ موا کر دیا تو نجانے کیوں سائیں کو ایک خیال آیا۔
کہنے لگا ہاں یہ ٹھیک ہے ،یہ میری ملکیت ہی تو ہیں فضلو نے ٹھیک کہا،مگر بھینسیں بھی ملکیت ہیں اور میں نشانی کے طور پر انہیں گرم سلاخوں سے داغ دیتا ہوں،جو میرا نشان ہے ۔
مجبور عبداللہ کے کپڑے اتروائے گئے اور کمر پہ کھولتی ہوئی سلاخ سے نشان لگا دیا گیا۔چیخوں سے آسمان ہل گیا مگر زمینوں کے جو مالک ہوتے ہیں ان کا دل کب کوئی چیز خاطر میں لاتا ہے۔سائیں نے نخوت بھرے لہجے میں کہا اب سالا ساری جندگی پگڑی پہن کے نہیں آئے گا ہاری پیدا ہوا ہے ہاری مرے گا۔اس کا باپ بھی ہاری تھا تو بیٹا بھی ہاری مرے گا اگر آج کی پٹائی سے بے غیرت بچ گیا تو۔اور پھر سائیں کے بندوں نے اللہ کے بندوں کو اٹھا کے انکے گھر کے سامنے پھینک دیا۔

☆☆☆☆☆

گاؤں میں خبر پھیل گئی ،کوئی حکیم کو بلالایا تو کوئی گورکن کو کہ عبداللہ کے بچنے کی امید کسی کو نہ تھی، ہونٹ پھٹ گئے تھے، آنکھیں سوج گئی تھیں، چھ دانت باہر نکل گئے تھے اور جو جلنے کا نشان تھا اس میں خون رس رہا تھا۔

چاچا دینو نے بڑی جان ماری، کوئی سات دنوں بعد عبداللہ بستر سے اٹھنے کے قابل ہوا۔

ننگ دھڑنگ زخموں سے چور پورے گاؤں کے سامنے پڑا رہنے سے جو ٹھیس خود اعتمادی کو پہنچتی ہے اس کا اندازہ کوئی اور کیسے لگا سکتا ہے؟

عبداللہ کچھ ہفتوں میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا، تب تک فضلو نے گاؤں چھوڑنے کی ٹھان لی تھی قریبی شہر میں چاچا دینو کا کوئی جاننے والا تھا اس نے مزدوری دلانے کا وعدہ کر لیا تھا کچھ پیسے بھی چاچا دینو اور کچھ اور دوستوں نے دے دیئے تھے جس سے کچھ روز کھانے کا گزارہ ہو سکتا تھا۔

فضلو نے اگلے دن صبح سویرے اپنا گھر اور تھوڑا بہت جو کچھ بھی اس میں تھا اسے چھوڑا اور شہر روانہ ہو گیا کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔

☆☆☆☆☆

اس شہر کو ایک بڑا گاؤں کہا جائے تو بہتر ہوگا، جو سہولیات بڑے شہروں میں ہوتی ہیں وہ یہاں عنقا تھیں مگر فضلو کو کام خوب مل جاتا تھا گاؤں کا مشقتی جسم تھا 16 گھنٹے کام کرتا تو بھی نہ تھکتا تھا اور اوپر سے ایمان دار۔ یہ دونوں ہی باتیں شہری لوگوں میں مفقود تھیں۔ کچھ دن تو عبداللہ شہری زندگی میں مٹر گشت کرتا رہا پھر ایک دن فضلو سے پوچھا:

ابا! اب کیا کروں؟

فضلو: بیٹا میری تو سات نسلوں میں کسی نے میٹرک نہیں کیا، مجھے کیا پتہ میٹرک کے بعد کیا کرتے ہیں تو ایسا کر ڈاکیہ لگ جا، ایڈریس / پتہ تو پڑھ لے گا نا؟ ہاں ہاں بابا تو فکر نہ کر۔

اور یوں عبداللہ ڈاکیہ بننے کی فکر میں لگ گیا۔ اسے خواب میں بھی یہی دکھتا کہ وہ ڈاکیے کی ''سرکاری نوکری'' کر رہا ہے اور لوگوں کو خط، ٹیلی گرام اور منی آرڈر پہنچا رہا ہے۔

کچھ دن بعد عبداللہ جنرل پوسٹ آفس کے سامنے انٹرویو کی لائن میں کھڑا تھا ایک آسامی اور کوئی 200 بندے کھڑے تھے، بیس سال سے ساٹھ سال تک کے، عبداللہ تو فقط پندرہ سال کا ہی ہوگا۔

خیر انٹرویو میں یہ کہہ کر منع کر دیا کہ عمر بہت کم ہے ذاتی سائیکل نہیں ہے کہ ڈاک جا کے ڈال سکے اور تجربہ نہیں ہے۔

عبداللہ نے بڑی کوشش کی کہ بات بن جائے مگر عبداللہ کی زندگی میں کوئی کام اتنا آسانی سے بھلا کب ہوا ہے اور یوں عبداللہ بے نیل و مرام گھر واپس آ گیا۔

ابا اب کیا کروں؟

اسی سوال کے ساتھ صبح عبداللہ پھر فضلو کے سامنے کھڑا تھا۔

فضلو نے آس پاس کچھ لوگوں سے مشورہ کیا، کسی نے کہا کلرک لگوا دے تو کسی نے پائلٹ بننے کا مشورہ دیا، کسی نے فوج کی نوکری کو زندگی کا حاصل بتایا تو کسی نے مزید پڑھائی کو مقصدِ حیات۔

الغرض فضلو نے تمام معلومات عبداللہ کے گوش گزار کر دیں۔

جب کچھ نہ سمجھ آیا تو گورنمنٹ کالج میں پری انجینئرنگ میں داخلہ لے لیا کہ ریاضی میں عبداللہ کے

ہمیشہ پورے نمبر آتے تھے۔
فضلو نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ کتابوں کے پیسے نہیں ہیں مگر عبداللہ نے سوچا کہ کسی سے مانگ کے کام چلا لے گا۔
پھوپھی کے گاؤں میں کوئی کالج تھا ہی نہیں ورنہ عبداللہ کب کا وہاں جا چکا ہوتا۔
عبداللہ کی شہرت کچھ کلاسوں بعد ہی ہوگئی۔ایک ہی تو تھا جو صبح سے لے کر رات تک یا تو لیکچر ہال میں ہوتا یا لائبریری میں عبداللہ آنکھ بچا کر کالج کے ردی کے ڈبے سے آدھی استعمال کی ہوئی کاپیاں اور پین پنسل بھی اٹھالیا کرتا تھا۔عبداللہ اپنے نوٹس شاپنگ بیگ میں لایا کرتا تھا اور یوں کالج بھر کو طنز کرنے کے لیے ایک کھلونا مل گیا تھا مگر عبداللہ نے تو جیسے نہ سننے اور نہ بولنے کی قسم کھائی ہوئی تھی جو دل چاہے جو مرضی بولتا رہے ،عبداللہ نے صرف پڑھنا تھا اور بس۔
کچھ ہفتوں بعد کالج میں ریاضی کے نئے استاد آئے ،عبداللہ کو یہ مضمون بہت پسند تھا مگر استاد کو اس کے سوالات چبھتے تھے۔
فیثا غورث ہو یا ٹرگنا میٹری،کواڈریٹک ایکویشن ہو یا الجبرا،عبداللہ کو اگر روزمرہ زندگی میں ان کا اطلاق سمجھ نہ آئے تو نہ وہ خود چین سے بیٹھتا اور نہ ہی ٹیچر کو بیٹھنے دیتا۔
روز روز کی اس تکرار کا نتیجہ یہ نکلا کہ ٹیچر کلاس میں آتے ہی سب سے پہلے عبداللہ کو باہر نکال دیتا۔
کچھ دن عبداللہ نے برداشت کیا مگر پھر کالج آنے کا فائدہ ہی کیا ہو جب کلاس ہی اٹینڈ نہ کر سکتا ہو۔
آج عبداللہ ٹیچر کے کہنے کے باوجود کمرے سے باہر نہیں گیا''میں کیوں جاؤں میں غلط سوال نہیں پوچھتا نہ ہی نیت آپ کو تنگ کرنے کی ہے،مگر آپ بلاوجہ جب چاہے مجھے سب کے سامنے ذلیل کرتے ہیں اور کوئی دکھ نہ ہوا گر اس کے بدلے کچھ سیکھنے کو مل جاوے ،آپ ظلم کرتے ہیں، اللہ پوچھے گا!۔''

یہ سننا تھا کہ ٹیچر نے کلاس ختم کرنے کا اعلان کیا اور ڈسپلنری کمیٹی میں عبداللہ کے خلاف درخواست دے دی۔

کالج پرنسپل نے عبداللہ کو اپنے والدین کو لانے کا کہا مگر عبداللہ جانتا تھا کہ اس کا باپ کبھی کالج نہیں آئے گا اور اگر اسے کسی ممکنہ پھڈے کی بھنک بھی پڑی تو وہ اپنے ہاتھ سے ہی عبداللہ کو مار ڈالے گا اور یوں کالج پرنسپل نے عبداللہ کی بات سنے بغیر یک طرفہ فیصلہ دے دیا اور عبداللہ کو کالج سے [Expelled] خارج کر دیا گیا۔

آج تو جیسے عبداللہ کی دنیا ہی ختم ہوگئی وہ خواب جو دیکھے تھے انجینئر بننے کے، کچھ کر دکھانے کے بڑا آدمی بننے کے سب چور ہو گئے۔

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گھر پہ کیا بتائے ،کس منہ سے جائے گا، خیر اسی سوچ بچار میں جب گھر پہنچا تو فضلو بہت خوش نظر آیا دیکھتے ہی کہنے لگا عبداللہ میں نے مزدوری چھوڑ دی ہے اور کرایہ پہ ایک ٹھیہ لے لیا ہے برتنوں کا۔اب میں برتنوں کا کام کروں گا آرام سے بیٹھ کر اس دن تک جب تک تو انجینئر نہیں بن جاتا اب شاید ہم بھی خوش ہو سکیں گے۔

مگر ابا آج مجھے کالج سے نکال دیا گیا ہے برے کردار Bad Character کی وجہ سے، اب کہیں اور داخلہ بھی نہیں ملے گا، فضلو کو اپنے بیٹے پہ پورا یقین تھا کہ کچھ بھی ہو اس کا کردار بے داغ ہے، ویسے بھی جب بھوک کی بیماری بدن سے چمٹی ہو نا تو خواہشوں کی ملکہ کوسوں دور رہتی ہے۔

فضلو نے اداس لہجے میں کہا عبداللہ مجھے لگتا ہے کہ تجھے مولوی کی بددعا لگ گئی ہے تو شاید ''بے نام'' ہی رہ جائے ،تو فکر چھوڑ اور میرے ساتھ ٹھیے پہ بیٹھا کر۔

اور یوں عبداللہ نے ٹھیے پہ بیٹھنا شروع کر دیا ساتھ میں وہ کوئی نہ کوئی کتاب ساتھ لے جاتا پڑھنے کو، آج کل زیادہ تر زور اسلامی کتابوں اور انگریزی سیکھنے پر تھا ایک دن ایک گاہک دکان پر آیا اسے لالٹین چاہئے تھی۔

فضلو نے ایک لالٹین اس کے سامنے رکھ دی اور کہا یہ 100 روپے کی ہے بڑی اچھی ہے

پائیدار، لیک بھی نہیں ہوتی، اس کا شیشہ بھی دستیاب ہے وغیرہ وغیرہ، کچھ ہی دنوں میں فضلو ایک گھاک سیلز مین بن چکا تھا۔

مگر مجھے تو ولایتی چاہئے گا ہک نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

فضلو نے ایک اور لالٹین نکال کے رکھ دی اور قیمت 300 روپے بتا کر زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگا اس کی خصوصیات کے بارے میں۔

تھوڑی سی تکرار کے بعد گاہک نے ولایتی لالٹین 250 میں خرید لی جب کہ لوکل وہ 50 میں بھی خریدنے پر آمادہ نہیں ہوا۔

جب وہ چلا گیا تو فضلو نے قہقہہ لگایا اور کہا سالے شہری لوگ اپنے آپ کو بہت عقلمند سمجھتے ہیں دونوں لالٹین ایک ہی جگہ کی بنی ہوئی ہیں صرف پیکنگ کا فرق ہے۔

عبداللہ کو یہ بات سخت ناگوار گذری اس نے باپ سے کہا۔ ابا تو تو بدل گیا ہے، شہری ہوا تجھے راس نہیں آئی، اب کیا تو جھوٹ بھی بولے گا۔

نہیں عبداللہ، یہ یہاں کا عرف ہے، ایسے ہر کام ہوتا ہے، شروع کے کئی ہفتوں میں سیدھی سچی بات کرتا رہا مگر بونی تک نہ ہوئی اب دیکھ کام دھندہ کیسا چمک رہا ہے۔

مگر ابا، جان دینی ہے اللہ پوچھے گا۔

ہاں بیٹا، کہتا تو تو ٹھیک ہی ہے چل وعدہ آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔

ضمیر بیچ کے اپنا امیر ہو جاتے
مگر ہم اپنی نظر میں حقیر ہو جاتے

اگر تیرا اور تیری ماں کا بھوکوں مرنے کا خیال نہ ہوتا تو کبھی یوں نہ کرتا۔

چھوڑ ابا، مجھے تو نہ ڈرا اب مرنے سے، مرنا ہوتا تو کب کا مر گیا ہوتا۔ بھوکا مرنا لکھا ہے تو ایسے ہی سہی پر جھوٹ نہ بولیں گے۔

یہ مفلسی جس سے لرزتا ہے زمانہ
کم ظرف میرے صبر کے ٹکڑوں پہ پلی ہے

کچھ روز بعد اخبار میں ایک نئے کالج کا اشتہار آیا جو کسی N.G.O نے غریب اور یتیم بچوں کے لئے کھولا تھا مگر وہاں انجینئرنگ کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی انہوں نے پری میڈیکل سے شروع کیا تھا اور کلاسیں بھی شام کو ہوتی تھی عبداللہ اسی شام کالج پہنچ گیا اور ایڈمیشن فارم جمع کروادیا۔

انٹرویو کے وقت تمام ماجرا سچ سچ کہہ سنایا کہ پچھلے کالج سے Bad Character کا سرٹیفکیٹ کیونکر حاصل ہوا۔ایڈمشن کمیٹی کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ یہ پوزیشن ہولڈر بچہ ہے اور اگر آ گیا تو اس کا نام مارکیٹنگ اور فنڈز کے حصول میں پوری طرح استعمال کر سکتے ہیں۔

مگر عبداللہ کی اس قدر صاف گوئی انہیں بالکل نہ بھائی، پرنسپل صاحب کہنے لگے برخوردار، تمہارے میٹرک میں مارکس ضرور اچھے ہیں مگر ساتھ ساتھ تم تھوڑے سے بے وقوف اور بدعقل بھی ہو۔

نہیں پرنسپل صاحب ،عبداللہ نے ان کی بات کو بیچ میں سے اچکتے ہوئے کہا، میں بے عقل ہوسکتا ہوں مگر بدعقل اور بے وقوف نہیں۔

سب ہنسنے لگے اور کہا کہ بے وقوف یہ تو ایک ہی بات ہے، بھلا بتاؤ اس میں فرق کیا ہے؟

جناب! بے عقل وہ ہوتا ہے جسے اللہ نے عقل دی ہی نہ ہو، اس بارے میں میں کوئی دعویٰ فی الوقت نہیں کرتا، آپ پڑھائیں گے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔

بدعقل وہ ہوتا ہے جس کے پاس عقل تو ہو مگر وہ اسے غلط کاموں میں استعمال کرے، میں ایسا کچھ نہیں کرتا۔

بے وقوف، وقوف سے نکلا ہے، جیسے کہ وقوف عرفہ، ٹھہرنے کو کہتے ہیں، ایسا شخص جو ٹھہر کے، ٹک کے کچھ نہ کر سکے وہ ہوا بے وقوف اور میرے میں یہ خصوصیت بھی نہیں پائی جاتی۔

ایڈمیشن کمیٹی نے مزید کچھ کہے بغیر فل اسکالرشپ کے ساتھ اس کے فارم پر دستخط کر دیئے۔اور یوں عبداللہ ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھنے لگ گیا اور وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے گھومتا رہا۔

کالج میں یوں تو سب معمول کے مطابق چل رہا تھا، عبداللہ کی ذہانت کا ڈنکا ہر سُو بج رہا تھا کوئی تقریری مقابلہ ہو یا بیت بازی کا، کوئی ڈرامہ ہو یا مضمون نِگاری، عبداللہ کا نام ہی اس بات کی ضمانت تھا کہ کالج کی پہلی پوزیشن آنی ہے عبداللہ نے بارہا اس کالج کے بچوں کو ہرایا جہاں سے وہ نکالا گیا تھا، بدلے کا جذبہ تو کوئی خاص تھا نہیں ہاں مگر ہر کام کو احسان [Excellence] پہ کرنے کا جنون اسے پہلی سے کم کسی بھی پوزیشن پہ ٹکنے نہ دیتا تھا۔ مگر ایک استاد ایسے تھے جو عبداللہ کو بے حد پسند کرتے تھے ان کا نام تھا عبدالرحمٰن وہ درس نظامی سے فارغ التحصیل تھے پرانے زمانے کے انڈیا سے پڑھے ہوئے تھے اور کالج میں اردو، اسلامیات اور مطالعۂ پاکستان پڑھاتے تھے عبداللہ نے کورس کی ساری کتابیں ازبر یاد کی ہوئی تھی، کیمسٹری کے Periodic Tables ہوں یا فزکس کے ایکویشن اور Laws، بائیولوجی کے Zoological Names ہوں یا باٹنی کے پودوں کی Classification، اسلامیات کی کتاب کی احادیث ہوں یا اردو کی غزلیں، عبداللہ سب یاد کر کے 2، 3 ماہ میں ہی فارغ ہو جاتا، شاید یہ بچپن کا اثر تھا کہ مانگی گئی کتابیں کچھ دنوں میں واپس کرنی ہوتی تھیں کہ اس کا دماغ اسی طرح Tune ہو گیا تھا اور حافظہ بہت تیز تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ عبدالرحمٰن صاحب وہ واحد استاد تھے جن کے پاس اپنے مضامین میں عبداللہ کے ہر سوال کا جواب ہوتا تھا۔

عبدالرحمٰن صاحب عبداللہ کو روز کوئی نئی دعا سکھاتے اور اللہ پہ توکل کا درس دیتے، وہ کہا کرتے یہ ساری محبتیں اللہ کی محبت کے سامنے ہیچ ہیں۔

ایک دن کہنے لگے، یہ آنکھ بڑی عجیب شئے ہے جب تک بند نہ ہو کھلتی ہی نہیں ہے۔

ایک دن دعا مانگی کہ ''اے اللہ تو جانتا ہے کہ تو تو ہے، میں میں ہوں!۔''

انہوں نے دو دعائیں تو عبداللہ کو ازبر کرا دی تھیں اور کہا تھا کہ روز بلا ناغہ مانگا کرو۔

ایک سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی دعا:

﴿رَبِّ اِنِّی لِمَآاَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍفَقِیْرٌ﴾[سورۃ القصص ۲۸:۲۴]

''الٰہی! میں اس کا محتاج ہوں کہ تو مجھ پر اپنی نعمت نازل فرمائے۔''

اور ایک یہ دعا کہ:

''اے اللہ! سب ایمان والوں کو معاف کر دے۔''

اور عبداللہ تواتر سے یہ دعائیں مانگا چلا جاتا۔

ایک عادت انہوں نے اور ڈالی عبداللہ کو، وہ تھی اللہ میاں کو خط لکھنے کی، وہ کہتے تھے جب کوئی بات ہو جاوے، جب کوئی خوشی دیکھو یا غم آوے تو اللہ کو خط لکھو، اسے سناؤ اپنی کہانی، اس سے کہو اپنی کتھا، اور کسی سے کچھ نہ مانگو۔

ہر حد سے ماوراء تھی سخاوت میں اس کی ذات
ہم آخری سوال سے آگے نہ جا سکے

عبدالرحمٰن صاحب نے عبداللہ کی طبیعت کو دیکھتے ہوئے اسے ایک بددعا بھی دی تھی کہ اللہ تجھے اتنا مصروف رکھے کہ تیرے پاس گناہ کی فرصت نہ ہو۔

اور عبداللہ ہمیشہ اس بات پر ہنسا کرتا۔

خیر انٹر کے امتحانات ہوئے اور عبداللہ نے پہلی پوزیشن حاصل کی پورے کالج میں۔

200 میل کی مسافت پہ ایک شہر تھا جہاں میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا، اور یوں عبداللہ ''ڈاکٹر صاحب'' بننے کی جستجو میں لگ گیا۔

میڈیکل کالج جاتے ہوئے اس نے ماں باپ اور سر عبدالرحمٰن کی خوب دعائیں لیں۔

مگر شاید زندگی کو کچھ اور ہی منظور تھا، وہاں درجن بھر سیاسی پارٹیوں کی تنظیمیں تھیں جو عبداللہ کی صلاحیتوں کو اپنے اپنے پولیٹکل ایجنڈے کی تقویت میں استعمال کرنا چاہتی تھیں مگر عبداللہ کو بھلا ان الجھنوں سے کیا مطلب، نتیجہ یہ نکلا کہ گفتگو اور مہذب دعوت، گستاخیوں اور بدتمیزوں پر چلی گئی اور آخر کار ایک دن ایک پارٹی کے لڑکوں نے عبداللہ کو خوب مارا، کپڑے پھاڑ دیئے اور کتابیں تک جلا دیں۔

اور اسے اٹھا کر تمام اساتذہ، پولیس سب کے سامنے کالج سے باہر پھینک دیا، پولیس والوں نے آ کے کہا اب نظر آئے تو کالج میں ہیروئن رکھنے کے جرم میں زندگی بھر جیل میں سڑا دیں گے۔ اور عبداللہ ''ڈاکٹر صاحب کے خواب'' کی لاش اٹھائے واپس آ گیا۔

ستارے کچھ بتاتے ہیں، نتیجہ کچھ نکلتا ہے
بڑی حیرت میں ہے میرا مقدر دیکھنے والا

☆☆☆☆☆

اباب کیا کروں؟

عبداللہ اپنے ازلی سوال کے ساتھ آج پھر فضلو کے سامنے کھڑا تھا مجھے کیا پتہ، تیرے پہ مولوی کی بددعا ہے، تو منحوس ہو گیا ہے، جہاں جاتا ہے پٹ کر واپس آجاتا ہے، کوئی کام تیرا بنتا نہیں ہے، مجھے نہیں پتہ، نہ مجھ سے پوچھ نہ مجھے بتا اور یہ کہہ کر فضلو اپنے آنے والے گاہک کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

مشوروں اور ملاقاتوں کا ایک سلسلہ پھر شروع ہوا، کسی نے کہا بی فارمیسی کر لو تو کسی نے ایسوسی ایٹ ڈپلومہ کرنے کو کہا، کسی نے بزنس ایڈمنسٹریشن کی راہ دِکھائی تو کوئی کمپیوٹر سائنس کا شیدائی۔

آج T.V پر ہالی وڈ کی کوئی فلم چل رہی تھی جو عبداللہ نے دکان کے ساتھ والے چائے کی ڈھابے پر دیکھی، خوب صورت اور نوجوان، لوگ سفید رنگ کے ایپرن پہنے، شیشے کی بوتلوں میں رنگ برنگے محلول گھماتے پتہ نہیں کیا ایجاد کر رہے تھے، کسی نے کہا کہ یہ دوائیاں بنا رہے ہیں تو کسی نے انگریزی نہ سمجھتے ہوئے موووی کو کیمیائی ہتھیاروں سے جوڑ دیا۔

خیر، آج رات خواب میں عبداللہ نے دیکھا کہ وہ وائٹ کوٹ پہنے دنیا کی بیماریوں کی کھوج لگا رہا ہے وہ صبح اٹھا تو مسکرا رہا تھا، اسے اپنی زندگی کی مقصد مل گیا تھا اور وہ تھا بی فارمیسی۔

بی فارمیسی کے لیے شہر کی بڑی یونیورسٹی میں داخلہ فارم جمع کروادِیا، فضلو لاکھ سمجھاتا رہا کہ فیس کے پیسے کہاں سے لائیں گے؟، رہے گا کہاں؟، کھائے گا کہاں سے؟

مگر عبداللہ ہمیشہ جواب دیتا کہ ابا میں 313 کے فارمولے پر چلتا ہوں، جو کام میں کر سکتا ہوں وہ کرتا ہوں، جو کر نہیں سکتا اس کے بارے میں پریشان بھی نہیں ہوتا۔

غزوۂ بدر میں 313 صحابہ کرام ﷺ کے پاس جو بھی تھا وہ لے کے پہنچ گئے، فتح جس کا مقدر ہو جائے تو سبیل خود ہی ہو جایا کرتی ہے۔

خیر وہی ہوا جس کا فضلو کو ڈر تھا، ایڈمیشن لسٹ لگی مگر عبداللہ کا نام تھا نہیں اس میں، عبداللہ سیدھا رجسٹرار کے پاس گیا، کہا کہ ''سرات بھر سے یونیورسٹی گیٹ پر بیٹھا ہوں کہ رہنے کی جگہ

نہیں ہے، ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے، میرا نام لسٹ میں نہیں ہے۔
رجسٹرار صاحب نے پوچھا کہ تمہارا ڈومیسائل کہاں کا ہے ہمارے پاس کوٹہ سسٹم ہے میں چیک کرتا ہوں۔
جناب ڈومیسائل تو اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں کا ہے۔
ہاں، اس ضلع کی صرف ایک سیٹ ہے۔
جیِ بالکل، وہ ایک سیٹ میری ہے، میرے سے زیادہ نمبر ضلع میں کسی کے بھی نہیں۔
ہاں! مگر آپ کے ضلع سے منتخب ہونے والے قومی اسمبلی کے ممبر ایجوکیشن منسٹر ہیں۔
ہاں تو [عبداللہ نے بے قراری سے پوچھا۔]
تو برخوردار، آئینی طور پر چانسلر کی ایک سیٹ ہوتی ہے اور اس پر ان کا بھانجا تمہارے ہی گاؤں کے ڈومیسائل سے منتخب ہو چکا ہے 53% مارکس لینے کے باوجود۔
اور عبداللہ کو اپنا وجود دھڑام سے فرش بوس ہوتا نظر آیا۔
''مقصدِ زندگی'' شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔ وہ دوائیاں، وہ خواب، وہ پراجیکٹس سب خاک میں مل گیا۔ اب کس منہ سے جائے گا واپس۔

یہ بہتر ہے سُلگتی زِندگی سے جان اب چُھوٹے
خدایا مجھ سے ارمانوں کا اب ماتم نہیں ہوتا

☆☆☆☆☆

ابّا اب میں کیا کروں؟

عبداللہ آج پھر اپنے بے بس باپ کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔

کچھ دنوں بعد اخبار میں اشتہار آیا کہ پاس والے شہر میں کمپیوٹر سائنس کا بیچلرز پروگرام شروع ہو رہا ہے۔ عبداللہ نے پھر صرف یہ سوچ کے فارم جمع کروایا کہ کچھ کرنا نہ کرنے سے بہتر ہے، ورنہ نہ تو اسے کمپیوٹر سائنس کی کوئی سمجھ تھی نہ شوق۔ پھر وہی 313 کا فارمولا۔

اس بار داخلہ تو مل گیا مگر اسکالرشپ نہ ملی کہ پہلی بار یہ پروگرام شروع ہو رہا تھا اور ایک خلقت تھی جو داخلہ چاہتی تھی ایسے میں یونیورسٹی کو کیا سوجھی تھی کہ وہ مفت میں داخلے دیتی پھرے۔

ایک ہزار روپے ماہانہ فیس تھی مگر فضلو کے لیے ہزار روپے ماہانہ دینا ناممکنات میں سے تھا بہت سمجھایا مگر عبداللہ بس دعائیں ہی مانگتا رہتا۔

''اے اللہ! تو محتاج نہیں چھوٹے بڑے لوگوں کا، تو جب چاہے جیسے چاہے دے دے، تجھے کوئی بجٹ تھوڑا ہی پاس کرانا ہوتا ہے اسمبلی سے، تو مجھے ایسے ہی دے دے، دیتا چلا جا، بس دیتا ہی رہے۔

اے اللہ، اے میرے مالک، اے میرے رب، تو مجھے اپنی قدرت کا مظہر بنا دے، لوگ مجھے دیکھ کر کہیں کہ جب اللہ کسی کو دینے پر آتا ہے نہ تو وہ ایسے دیتا ہے، جب کسی کو بلاوجہ نوازتا ہے نہ تو وہ ایسے ہوتا ہے، او میرے اللہ، تو وجہ کا محتاج نہیں تو مجھے بلاوجہ ہی دے دے۔ آمین۔''

تقدیر جسے کہتے ہیں وہ اس کی رضا ہے
وہ چھوٹے بڑے سارے خداؤں کا خداہ ے

☆☆☆☆☆

اسکالرشِپ تو نہ ملنی تھی نہ ملی مگر عبداللہ کو شام میں نوکری مل گئی، یونیورسٹی کے ساتھ قائم دھوبی گھاٹ پر۔

دن بھر پڑھنا اور رات بھر کپڑے دھونا، اتنے پیسے مل جاتے کہ عبداللہ فیس جمع کروا دیتا اور ایک آدھ وقت کچھ کھا بھی لیتا۔

کم کھانے کی عادت تو گھٹّی سے ملی تھی لہٰذا اگر ایک وقت بھی کھانا مل جائے تو غنیمت تھا۔

پہلا سمسٹر ختم ہوا، عبداللہ کا 4 میں سے GPA4 جی پی اے آیا تو سب کو پتہ چلا گڈری کا لعل کسے کہتے ہیں۔ جہاں کچھ دوست بنے وہاں بہت سے دشمن بھی۔

دیکھ، تو پوزیشن مت لایا کر۔ ایک روز ایک بڑے باپ کی اولاد نے راستہ روک کے عبداللہ سے کہا۔

اس کے باپ کو سب پیر صاحب کے نام سے جانتے تھے اور ان کی یونیورسٹی اور معاشرے میں ''خدا ترسی'' کی وجہ سے بڑی شہرت تھی۔ عبداللہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا کیوں؟

کیونکہ تو مزارعے کی اولاد ہے اور ہم پیرزادے ہیں، گھر والے مذاق اڑاتے ہیں کہ مزارعہ کا بچہ ٹاپ کر رہا ہے اور تم لوگ فیل آ رہے ہو، اب اگر تیری پوزیشن آئی تو ٹانگیں توڑ دیں گے۔

عبداللہ نے پورا عزم کر لیا کہ اگلے سمسٹر میں پوزیشن نہیں لے گا، کیونکہ اگر اس بار پٹا تو یہاں سے بھی باہر ہو گا اور ابا تو مار ہی ڈالے گا۔ فضلو نے تو اب پیسے بھی مانگنا شروع کر دیئے تھے عبداللہ سے، کہ اکلوتے بیٹے سے نہ مانگے تو کس سے مانگے؟

مگر عبداللہ کا تو اپنا گزارہ مشکل سے ہوتا تھا، مانگے کی کتابوں سے تو بھلا وہ گھر پیسے کیسے بھیجتا؟

خیر اگلے امتحانات آئے، عبداللہ نے جانتے بوجھتے ہوئے صرف آدھے سوال حل کیے حالانکہ اسے پورا پیپر آتا تھا تاکہ پوزیشن نہ آئے صرف پاس ہو جاؤں۔

مگر اللہ کا کرنا ایسا کہ باقی کسی سے وہ آدھے سوال بھی حل نہ ہوئے اور بُرے مارکس کے باوجود اس کی پوزیشن آ گئی۔

پہلا سمسٹر GPA 4 پہلی پوزیشن، دوسرا سمسٹر GPA 2.8 پہلی پوزیشن ،اب بے چارہ کیا کرے اور کہاں جائے؟

پیر صاحب کے بچے اور اس کے دوست جہاں دل چاہتا عبداللہ کو روک لیتے، کبھی نوٹس پھاڑ دیتے تو کبھی چپل اتروا لیتے ۔عبداللہ صرف ایک درخواست کرتا کہ مجھے عینک سنبھالنے دو کیونکہ یہ میں Afford نہیں کرسکتا، اب مارو۔اور یوں پٹ پٹ کے دو سال آخر پورے ہونے ہی لگے۔

شاگرد تو شاگرد، عبداللہ اپنے استادوں کے بھی کان کترنے لگا۔تیسرے سمسٹر میں کمپیوٹر کی مشہور کمپنی نے پروگرامنگ کے مقابلے کروائے، عبداللہ کی پاکستان بھر میں دوسری پوزیشن آ گئی۔

☆☆☆☆☆

آج عبداللہ کی زندگی کا بڑا اہم دن تھا، آج اس کے بیچلرز پروگرام کا آخری پرچہ تھا، آج کے بعد نہ اس نے کبھی پڑھنا تھا نہ کپڑے دھونے تھے۔ اس کا موڈ تھا پرچہ کرتے ہی سیدھا پھوپھی کے گاؤں جاؤں گا اور نتیجہ نکلتے ہی شہر میں کوئی نوکری کرلوں گا۔ پرچے بھی اس نے آخری سمسٹر میں پورے کیے تھے کہ رزلٹ کے بعد کسی سے ملنے کا موقع کہاں آنا تھا؟

عبداللہ پورے انہماک سے پرچہ کر رہا تھا، پرچہ خاصا مشکل تھا مگر عبداللہ کے لیے نہیں، اتنے میں باہر شور اٹھا، باقی تمام طلباء نے پرچے کو آؤٹ آف کورس قرار دیتے ہوئے کاپیاں پھاڑیں اور پرچے کا بائیکاٹ کرتے ہوئے باہر چلے گئے۔ عبداللہ نے کسی کی فکر کبھی کی تھی جواب کرتا۔ اس نے سر جھکا کے خاموشی سے جلدی جلدی پیپر کیا اور باہر نکل گیا۔

باہر آیا تو جیسے میلہ لگا ہوتا ہے، لڑکے، ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے اور لاٹھیاں اور سامنے معافی مانگتے ہوئے اساتذہ اور اسٹاف۔

اتنے میں کنٹرولر آف ایگزامینشن آئے اور اعلان کیا کہ کیونکہ ایک بچے نے پرچہ مکمل حل کر کے جمع کروادیا ہے اس لیے پیپر Count ہوگا۔

اس کا جو رزلٹ آئے گا سو آئے گا آپ سب فیل۔ اور یہ کہہ کر وہ چلے گئے لڑکوں کو یہ معلوم کرنے میں دیر نہ لگی کہ وہ بچہ کون تھا؟

عبداللہ شکرانے کے نفل ادا کرنے مسجد میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ ''پیر صاحب'' کے بچوں اور اس کے دوستوں نے اسے دبوچ لیا۔

بس پھر کیا تھا، مار، گھونسوں، لاتوں، لاٹھیوں اور مکّوں کی وہ تکرار کہ پوری یونیورسٹی اس شور سے گونج اٹھی، عبداللہ کی حالت دیکھ کر اس کے دشمن بھی رو پڑے، لاٹھی مار کے سر خونم خون کر دیا، پانچ پسلیاں توڑیں، پاؤں کے انگوٹھے کا ناخن کھینچ کے باہر نکال دیا اور جاتے جاتے ہاتھ کی انگلیاں لکڑی کی مدد سے توڑ گئے۔

کوئی جگہ ایسی تھی نہیں جسم پر جہاں زخم نہ آیا ہو، جب غصہ رفو ہوا تو سب لڑکے عبداللہ کو مردہ سمجھ کے

چھوڑ کے بھاگ گئے۔ جب تک ہوش رہا عبداللہ صرف ایک ہی بات دہراتا رہا۔ ''اللہ پوچھے گا۔''
کچھ اساتذہ اور بچوں نے مل کے عبداللہ کو یونیورسٹی کی گاڑی میں ڈالا اور اس کے گھر پہنچایا۔
سات دن بعد عبداللہ کو سرکاری ہسپتال کے بستر پر ہوش آیا، ابا کو 20 ہزار روپے ادھار لینا پڑا اس کی زندگی بچانے کے لیے۔
عبداللہ نے ایک آہ کے ساتھ آنکھ کھولی تو ماں کا روتا ہوا چہرہ سرہانے پایا، ماں کا غم ہلکا کرنے کو وہ مصنوعی ہنسی کے ساتھ گویا ہوا:
اماں مرا تھوڑی ہی ہوں ابھی زندہ ہوں، تو رو کیوں رہی ہے؟
عبداللہ تو مر ہی جاتا تو اچھا ہوتا، اس عمر میں بوڑھے باپ کو یہ دن تو نہ دیکھنے پڑتے۔
پیر صاحب نے پولیس بھیج دی تھی، محلے والوں نے بڑی مشکل سے ''معافی نامہ'' دے کر جان چھڑائی ہے۔
پیر صاحب نے چار گھنٹوں تک گھر کی صفائی بھی کروائی۔
عبداللہ اس سے اچھا ہوتا کہ تو پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔ اور ماں روتے روتے کمرے سے باہر نکل گئی۔
عبداللہ نے آسمان کی طرف نظر کی اور مسکراتے ہوئے شعر پڑھا:

وہ کیا کرے جو تیری بدولت نہ ہنس سکا
اور جس پہ اتفاق سے آنسو حرام ہیں

عبداللہ نے شعر ابھی پورا کیا ہی تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور سر عبدالرحمٰن اور چاچا دینو دونوں چلتے ہوئے آئے۔ عبداللہ نے پوری کوشش کی کہ اٹھ کے ان کا استقبال کر سکے مگر جسم نے ساتھ نہ دیا۔ اس نے پھر مسکراتے ہوئے شعر پڑھا:

اے درد تو ہی اٹھ کہ وہ آئے ہیں دیکھنے
تعظیم کی مریض میں طاقت نہیں رہی۔

عبدالرحمٰن صاحب اور چاچا دینو نے خوب پیار کیا اور ڈھیر ساری دعائیں دیں۔

عبداللہ نے چاچا دینو سے پوچھا، چاچا کوئی موٹی سی بددعا بتا کہ مانگوں اور سامنے والوں کا بیڑہ غرق ہو جاوے۔

چاچا نے سنتے ہوئے کہا بیٹا معاف کر دے، ایسے نہیں کہتے۔

نہیں چاچا میں سنجیدہ ہوں، اتنی دعائیں بتاتا ہے بغیر پوچھے ہی، ایک بددعا بھی سِکھا دے پوچھنے پر۔

عبداللہ! چپ سے بڑی بددعا کوئی نہیں ہوتی، جب بندہ بولتا ہے نہ تو قدرت خاموش رہتی ہے جب بندہ چپ ہو جاتا ہے تو قدرت انتقام لیتی ہے اور اس کا انتقام بہت برا ہے۔

عبداللہ نے سمجھنے نہ سمجھنے کی کیفیت میں التجائیہ نظروں سے عبدالرحمٰن صاحب کی طرف دیکھا، انہوں نے اشکبار آنکھوں سے یہ آیت پڑھی:

﴿ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

[سورۃ الانعام ۶:۴۵]

''غرض ظالم لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی اور سب تعریف اللہ رب العالمین ہی کیلئے ہے۔''

☆☆☆☆☆

کچھ دن بعد لڑکھڑاتے ہوئے عبداللہ ہسپتال سے اپنے گھر میں داخل ہو رہا تھا۔
ابا! تو نے معافی کس بات کی مانگی، مارا تو انہوں نے تھا، تو اتنا غریب اور ڈرپوک کیوں ہے؟

ظلم بچے جَن رہا ہے کوچۂ و بازار میں
عدل کو بھی صاحب ِاولاد ہونا چاہئے

دیکھ ابّا، آپ میرے ماں باپ ہو، مجھے عزیز ہو، مگر جس طرح زندگی آپ گزار رہے ہو اور مجھے دے رہے ہو مجھے یہ زندگی نہیں چاہئے۔
اسی کا نام زندگی ہے تو میں آج اسے اپنے ہاتھوں سے ختم کر دوں گا۔
نہ آپ ڈھنگ سے روٹی دے سکتے ہو نہ کپڑے نہ چھت، نہ ہی میری حفاظت کر سکتے ہو اور نہ ہی ان لوگوں کے خلاف پرچہ کر سکتے ہو جنہوں نے ساری یونیورسٹی کے سامنے مجھے مارا۔
میں آج دریائے سندھ پہ جا کے خودکشی کروں گا اور جب خدا کے پاس پہنچوں گا تو خود اپنے اللہ سے بات کروں گا۔
یہ گفتگو سن کے فضلو اور عبداللہ کی ماں رونے لگی اور روتے روتے کہنے لگی نہ میرے لعل ہمیں معلوم ہے قصور تیرا نہیں ہے، یہ تو تیری قسمت ہی ایسی ہے۔
تو محنتی تو ہے نا، تو بس محنت کئے جا اور ایک دن تو ضرور کامیاب ہو جائے گا، سکس پھول [Successful] بن جاؤے گا۔
اس جملے نے عبداللہ کی سوچ کا دھارا کہیں اور بدل دیا، ابا کیا مطلب، کامیابی [Success] کسے کہتے ہیں؟ میں ایسا کیا کروں کہ تو فخر سے کہے کہ میرا بیٹا کامیاب ہو گیا۔
بتانا اور میں بالکل ویسا ہی کروں گا۔
دیکھ عبداللہ! پاکستان میں 99 فیصد مسائل پیسے سے حل ہو جاتے ہیں تو اگر لاکھ روپے مہینہ کما لے تو میں سمجھوں گا تو کامیاب انسان ہے۔
ابا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا، لاکھ کبھی خواب میں بھی دیکھے ہیں؟

خیر عبداللہ نے کاغذ پنسل نکالا اور زخمی انگلیوں سے کسی نہ کسی طرح لکھ ہی ڈالا کہ لاکھ روپے مہینہ کمانا ہے۔

اچھا اماں، تو بتا، تو کسے کامیابی کہتی ہے، تیرے لیے کیا کروں۔

بیٹا مجھے پیسہ ویسہ نہیں چاہئے ، تیری خوب صورت سی دلہن ہو اور میرے خوب صورت سے پوتے، مجھے اس دنیا سے اور کچھ نہیں چاہئے۔

عبداللہ نے یہ بھی لکھ دیا کہ خوب صورت لڑکی سے شادی کرنی ہے اور بچے پیدا کرنے ہیں۔

پھر اس کے بعد تو جیسے عبداللہ کے ہاتھ میں مشغلہ آ گیا، وہ جگہ جگہ جاتا اور سب سے پوچھتا کہ کامیابی [Success] کیا ہے میں ایسا کیا کروں کہ آپ سب لوگ کہنے پر مجبور جائیں کہ میں کامیاب ہوں؟

محلے والے، مسجد والے، چوھدری صاحب، اساتذہ، جنہوں نے مارا تھا، پیر صاحب الغرض ہر وہ بندہ جس سے عبداللہ بات کر سکتا اس سے وہ یہی ایک سوال پوچھتا رہا۔

پیر صاحب نے کہا جس دن تو یہاں گاڑی میں بیٹھ کر آئے گا میں سمجھوں گا تو کامیاب ہے۔

کسی نے راڈو کی گھڑی بتائی تو کسی نے کوئی گاڑی، کسی نے ملک کی مشہور یونیورسٹی میں جانے کا نام لیا تو کسی نے کتاب لکھنے کو کامیابی ٹھہرایا، کسی نے امریکہ اور کینڈا میں جانے کو کامیابی کہا تو کسی نے M.I.T سے پڑھنے کو، کسی نے ناسا میں کام کو کامیابی بتایا تو کسی نے کوئی بڑی اسکالرشِپ کا نام لیا، کسی نے سعودی عرب کا نام لیا تو کسی نے جزیرہ ہوائی کا، الغرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

عبداللہ کے پاس کوئی لگ بھگ 200 کے قریب وضاحتیں جمع ہو گئیں اس ایک لفظ ''کامیابی'' کی جسے آس پاس کے لوگ اور ہمارا معاشرہ ''کامیابی'' گردانتا ہے۔

☆☆☆

عبداللہ نے آج رات اللہ کو پھر خط لکھا:

''میرے پیارے اللہ سائیں!

اک گردنِ مخلوق ہے جو ہر حال میں خم ہے
اک بازوئے قاتل ہے جو خونریز بہت ہے

اللہ سائیں، تو جانتا ہے کہ کیا ہوا، کس نے کب کب مارا، کیوں کیوں مارا، کس لیے مارا، تو تو ہے میں میں ہوں۔

میرے مالک! میں نے تو کہا تھا کہ مجھے اپنی قدرت کا مظہر بنا دے، یہ کیا کیا تو نے کہ عذاب کو بھی شرم آئے، میرے مالک یہ اگر میرے گناہوں کی سزا ہے تو معاف کر دے، سخی کی شان ہوتی ہے کہ وہ پکڑے تو چھوڑ دیا کرتا ہے۔

اگر تو آزمائش ہے تو یاالٰہی مجھے کب دعویٰ ہے طاقت کا، میں تو ایک غریب، کمزور اور مفلوک الحال شخص ہوں، کچھ اگر ہے عمر بھر کے سرمائے میں تو تجھ پر یقین، تیری محبت، تیرا نام۔

تو اگر چاہے تو ذلیل کروا دے، چاہے تو عزت دے دے، میں شکایت نہیں کروں گا، مگر التجا ہے دو جہاں، کل کائنات کے سرکار، میری سن، مجھے عزت دے دے، تیرے لیے کیا مشکل کہ تو کم تر چیزوں میں سے عزت دے دے، حقیر کو تاج پہنا دے اور لوگ اسے بادشاہ سمجھتے ہوئے تالیاں بجائیں۔

عرش والے میری توقیر سلامت رکھنا
فرش کے سارے خداؤں سے الجھ بیٹھا ہوں

یاالٰہی، اب زندگی کا مقصد 198 چیزیں ہیں جو دنیا والوں نے لسٹ میں لکھوائی ہیں۔ یہ میری زندگی کا مقصد، یہی ترجیحات اور یہی To Do List [TDL] ہے۔

بظاہر یہ سب ناممکنات میں سے ہیں، ہزار روپے ماہانہ سے لاکھ روپے ماہانہ پر جمپ، پیدل سے گاڑی، اور ایسے شخص کا امریکہ جانا جسے آج تک ٹرین میں بیٹھنا نصیب نہ ہوا ہو، ایک دیوانے کی

بڑ ہی تو ہے۔

کون مانے گا کہ یہ لسٹ یا ان میں سے 10 فیصد بھی پوری ہو سکتی ہیں اے میرے مالک! اپنے آپ کو دیکھتا ہوں تو سانس بھی ادھار لگتی ہیں، تجھ پہ نظر کرتا ہوں تو یہ لسٹ ہیچ نظر آتی ہے۔

تو کروادے پوری، اپنی شان سے، بلا وجہ کروادے، تو بول دے کن، فیکون ہو جاوے گا، تو دینے والا بن میں لینے کو بے تاب بیٹھا ہوں۔

اے میرے مالک! میں تیرا نام لے کے شرط لگانے جا رہا ہوں دنیا سے، دیکھ رسوا نہ کروائیو یہ بے نام تیرے نام پہ اِتراتا ہے، لاج رکھ لے۔ اگر تو نے لسٹ پوری کروادی اور مجھے [Successful] بنا دیا تو میرا وعدہ جو تو کہے گا وہ کروں گا اور اس کے خلاف کچھ بھی نہ کروں گا، میرا وعدہ ہے میرے مولا۔

یہ عبداللہ کا وعدہ ہے اپنے اللہ سے۔

میرے اللہ میں یہ لسٹ اس خط کے ساتھ منسلک کر رہا ہوں۔

تو وفا کیجیو میرے رب۔ بس تجھ سے ہی وفا کی امید ہے آمین! ثم آمین!

میں اس شہر عداوت میں رہتا ہوں کہ جہاں
لوگ سجدوں میں بھی اوروں کا برا چاہتے ہیں

☆☆☆☆☆

کچھ ہی روز بعد نتیجے کا اعلان ہوا، عبداللہ کی یونیورسٹی میں سکینڈ پوزیشن آئی۔ اس نے یہ جاننے کی زحمت ہی نہ کی کہ فرسٹ کون، کیونکر اور کیسے آیا۔

ابا سے 300 روپے لیئے، اور شہر روانہ ہو گیا۔

اب ماسٹرز میں داخلہ بھی لینا تھا اور جاب بھی ڈھونڈنی تھی اور رہنے کا انتظام بھی کرنا تھا۔ 300 میں سے 60 روپے کرائے میں چلے گئے تھے بس کے۔

جس یونیورسٹی نے بی فارمیسی میں داخلہ نہیں دیا تھا وہاں جانے کا من نہیں ہوا، پرائیویٹ یونیورسٹیز کی فیس اتنی زیادہ کہ داخلے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا، ایسے میں ایک پرائیویٹ یونیورسٹی کا اشتہار نظر آیا جسے کمپیوٹر لیب میں اسٹنٹ درکار تھا، پیسے بچانے کی غرض سے کوئی چار میل پیدل چل کے پہنچا تو حلیہ بہت خراب تھا۔

پاؤں میں گرد آلود چپل، شلوار قمیص اور سادگی، پرائیویٹ یونیورسٹی کے انفارمیشن ڈیسک پہ بیٹھی خاتون نے ایسے بات کی کہ جیسے وہ کوئی فقیر ہو۔

میم، داخلہ فارم دے دیں M.Sc میں ایڈمشن کا۔

ہزار روپے کا ہے، آپ کے پاس پیسے ہیں۔

جی نہیں۔

تو بیٹا فارم خریدنے کے پیسے تو ہے نہیں تو فیس کہاں سے دو گے؟

پتہ نہیں۔ اچھا آپ کے پاس لیب اسٹنٹ کی جاب آئی ہے؟

ہاں! مگر تمہاری جاب کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

کیوں؟

اپنا حلیہ دیکھا ہے؟

وہ تو میں سفر سے آ رہا ہوں نا، میں ٹھیک کر لوں گا۔

اچھا بیٹھو، ابھی لیب انچارج آتے ہیں تو میں بات کراتی ہوں تمہاری۔

آپ کے پاس واش روم ہے،عبداللہ نے تھوڑی دیر بعد کہا تو میم نے اسٹاف واش روم کی طرف اشارہ کر دیا اور عبداللہ جھٹ گھس گیا کہ انٹرویو سے پہلے ہاتھ منہ دھو لے۔

واش روم میں بھی وہ دعا ہی مانگ رہا تھا۔

''یا اللہ! ان جلاّدوں کے دل میں رحم ڈال، جاب دلا دے تو بعد میں پڑھائی کی بھی کوئی صورت نکلے، تو رحم کر میرے اللہ، وعدہ یاد ہے نا! مجھے بھی یاد ہے۔''

عبداللہ اپنی دھن میں مگن مانگے جا رہا تھا اور اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ کب کون ساتھ والے واش روم میں آیا اور چلا بھی گیا۔

عبداللہ باہر نکلا تو وہ میم صاحب گرم ہو گئیں۔

تمہارے باپ کا گھر ہے ،جا کر بیٹھ ہی گئے ۔رفیع صاحب آئے تھے انہوں نے تمہیں دیکھ لیا ہوگا تو کیا کہیں گے، وہ یونیورسٹی کے ریکٹر ہیں، اور غصے کے بہت تیز۔دفع ہو جاؤ اب یہاں سے۔

عبداللہ کی تو جیسے جان ہی نکل گئی، اس نے ابھی مین گیٹ سے باہر قدم ہی رکھے تھے کہ سکیورٹی گارڈ بھاگتا ہوا اس کی طرف آیا۔

عبداللہ کے ہاتھ اور پاؤں منجمد ہو گئے، صرف دل سے اتنا نکل سکا، اللہ اب نہ پٹوائیو، زبان تو گنگ ہو گئی تھی۔

چلو، تم کو بڑے صاحب نے بلّوایا ہے۔

ک ک کس کو؟

تمہیں لڑکے اور کسے؟

اور یہ کہہ کر گارڈ تقریباً عبداللہ کو پکڑ کر ریکٹر آفس میں لے گیا۔

سامنے کوئی پچاس برس کے انتہائی حلیم پرسنلٹی والے صاحب بیٹھے ہوئے تھے ،انہوں نے مسکرا کر دیکھا اور کہا بچے کیا نام ہے آپ کا؟

عبداللہ اتنا پریشان ہوا کہ اس کے منہ سے ریکٹر کا نام نکل گیا۔

رفیع، جی رفیع، اوہ میرا مطلب ہے عبداللہ۔
آج زندگی میں پہلی بار عبداللہ کو کسی نے ''آپ'' کہہ کر مخاطب کیا تھا۔
بیٹھ جاؤ، چائے پیئو گے؟
نن نن نہیں، میں ٹھیک ہوں۔
مگر ریکٹر صاحب نے چائے اور بسکٹ لانے کا کہہ دیا۔
جب تک عبداللہ چائے اور اس میں بسکٹ ڈبو ڈبو کر کھاتا رہا وہ چپ چاپ اسے دیکھتے رہے۔
جب عبداللہ فارغ ہوا تو کہنے لگے۔ کیوں آئے ہو آج یونیورسٹی میں۔
اور عبداللہ نے ایک سانس میں جاب اور پڑھائی دونوں کی کتھا سنا دی۔
کام تو ہم تمہیں دے دیں گے مگر کیا کر بھی لو گے؟
عبداللہ نے اپنی تعلیمی اسناد سامنے رکھ دین اور کہا کہ سر کمپیوٹر پروگرامنگ جیسے مجھے آتی ہے شاید ہی دنیا میں کسی کو آتی ہو۔
ٹھیک ہے، کل سے کام پر آجاؤ، صبح نو سے چار بجے تک کام اور شام 4:30 بجے سے 8 بجے تک شام کی کلاسوں میں ماسٹرز کر لو۔
فیس میں نے معاف کر دی ہے، تنخواہ چھ ہزار روپے مہینہ بولو! منظور ہے؟
آپ مذاق تو نہیں کر رہے؟
نہیں، میرے پاس اتنا ٹائم نہیں ہوتا۔
جی، میں حاضر ہو جاؤں گا، اب اجازت۔
اچھا سنو! رہتے کہاں ہو؟
جی، ابا کے دوست ہیں فلاں جگہ پر ان کے پاس کچھ دن گزاروں گا۔
اوہو، وہ جگہ تو یہاں سے کوئی 60 میل دور ہے۔
تم لائبریری میں سو سکتے ہو؟

جی بالکل۔ میں جھاڑو لگا کے صاف بھی کر دیا کروں گا۔
نہیں جھاڑو لگانے والے بہت ہیں، ٹھیک ہے کل آؤ پھر کچھ سوچتے ہیں۔
عبداللہ پھولا نہیں سما رہا تھا، شہر میں پہلا دن، جاب اور پڑھائی اور رہائش سب مل گئے۔
آج اسے رَبِّ اِنَّـــــــــــــــی والی دعا کا اِدراک ہوا۔ پوری رات مسجد میں بیٹھا اپنے اللہ سائیں کا شکر ادا کرتا رہا۔

☆☆☆☆☆

کچھ روز بعد ریکٹر صاحب آئے تو عبداللہ لائبریری میں رات کے وقت کتابیں سر کے نیچے رکھ کے لیٹا ہوا تھا۔ ریکٹر صاحب نے بلایا اپنی گاڑی میں بٹھایا اور بازار لے گئے۔

پینٹ شرٹس، ٹوپی، بنیان، بیلٹ جوتے، پرفیوم اور پین کیا نہیں تھا جو انہوں نے نہ دلایا ہو۔

عبداللہ کی تو باچھیں ہی کھل گئیں، Cross کا پین، Mark & Spencer کی شرٹس اور Levis کی جینز۔

اور یوں عبداللہ کی نوکری اور پڑھائی چلتی رہی۔

تین سالوں کے عرصے میں عبداللہ نے ماسٹرز بھی کرلیا امتیازی نمبروں کے ساتھ، اور نوکری میں ترقی کرتا ہوا لیکچرار بھی بن گیا اسی یونیورسٹی میں۔

مگر ان تین سالوں میں وہ یونیورسٹی سے سوائے جمعہ یا عید پڑھنے کے کبھی باہر نہیں گیا۔ ماں، باپ اور سر عبدالرحمٰن سے فون پر بات ہو جاتی اور پھوپھی اور چاچا دینو سے خط کے ذریعے۔

کچھ سالوں سے چاچا دینو، ہر سال حج پر جا رہے تھے، پورے سال پیسے جمع کرتے، کم پڑ جاتے تو عین موقع پر کوئی پیسے دے دیتا اور چاچا دینو یہ جا وہ جا۔

ایک دن عبداللہ نے خط میں ان سے پوچھا۔

چاچا، گورنمنٹ کا کوٹہ ہوتا ہے، تم ہر سال ایک آدمی کی سیٹ مارتے ہو، فرض تو ایک بار ہوتا ہے نا تم بار بار کیوں جاتے ہو؟

اگر کوئی آدمی نہ جا سکا اور مر گیا اگلے سال سے پہلے تو گناہ تمہاری گردن پر ہوگا۔

چاچا دینو کا جواب ملا:

''بیٹا میں تو فارم جمع کروا دیتا ہوں، ہر سال قرعہ اندازی میں میرا نام ہی کیوں نکلے ہے؟ وہ بلاوے ہے تو جاوں نا؟

خود سے تھوڑا ہی جاتا ہوں!۔''

اس سال عبداللہ نے چاچا دینو کے ساتھ اپنے باپ کو بھی حج پہ بھیج دیا، اب اس کی تنخواہ لگ بھگ

20 ہزار کے قریب ہو چکی تھی، اباحج سے آیا تو اعلان کیا کہ اس کے گروپ میں شہر کے کوئی صاحب تھے اور ان کی لڑکی سے عبداللہ کی شادی پکی کر آئے ہیں۔

عبداللہ نے جھٹ اپنی TDL کھولی۔ ''خوب صورتی'' کی کنفرمیشن کرائی اپنی ماں سے اور شادی کر لی بنا لڑکی کو دیکھے بنا نام پوچھے۔

بینا عبداللہ کی دلہن کا نام تھا جسے وہ پیار سے بلّو بلاتا تھا۔

شبِ عروسی میں گھونگھٹ کھول کے عبداللہ نے یہ شعر پڑھا:

تو نے چھو کر مجھے پتھر سے پھر انسان کیا
مدتوں بعد میری آنکھ میں آنسو آئے

بلّو نے عبداللہ کو اِک نئی زندگی سے روشناس کرایا، وہ اچھے گھر سے آئی تھی اور عمر بھی صرف سولہ سال کی تھی، عبداللہ اس وقت بمشکل اکیس، بائیس کا ہی تھا۔ بلّو نے عبداللہ کو بڑے ہوٹلوں میں کھانا، اچھا پہننا اور انگریزی سِکھائی۔ اور عبداللہ کچھ ہی روز میں مریضِ عشق بن گیا۔

کہاں تک در بدر پھرتے رہیں گے
تمہارے دل میں گھر کرنا پڑے گا

ہنی مون کے لیے وہ بیوی کو لے کر کشمیر چلا گیا، زندگی میں پہلی بار اتنی ساری خوشیاں اتنے تواتر سے ملی تھیں کہ عبداللہ کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ انہیں ہینڈل کیسے کرے۔

وہ ہر بات پہ بلّو کو ایک شعر سناتا اور وہ شرما کے دہری ہو جاتی۔

بیٹھے رہو ایسی بھی مصور سے حیا کیا
کاہے کو کھنچے جاتے ہو تصویر سے پہلے

کچھ ہی عرصے بعد عبداللہ ایک پیارے بیٹے کا باپ بن گیا، جس کا نام اس نے اپنے استاد کے نام پر عبدالرحمٰن رکھ دیا، اور یوں TDL سے ایک کام اور کٹ گیا۔

☆☆☆☆☆

عبداللہ نے اب دنیا بھر کی اسکالرشِپ اور ملک کی مایہ ناز یونیورسٹیز میں داخلے کے لیے Apply کرنا شروع کر دیا۔

روزانہ اخبار میں سے تراشے نکالتا اور رات بھر آفس سے ملنے والے لیپ ٹاپ پہ کام کرتا رہتا۔اسی اثنا میں اس نے مختلف رسائل میں کمپیوٹر سائنس پر لکھنا بھی شروع کر دیا۔

پڑھانے کی کوئی فکر اسے تھی نہیں کہ کمپیوٹر کے دس سے اوپر مضامین کی کتابیں اسے منہ زبانی یاد تھیں،صرف ایک مارکر اور بورڈ چاہئے اور عبداللہ شروع۔

یونیورسٹی میں اس کی پہچان بہترین ٹیچر کے طور پر ہوتی جو طالب علموں کے تمام سوالات کے جواب دیتا۔

اب آہستہ آہستہ عبداللہ یونیورسٹی کی سینئر مینجمنٹ میں مقام بنانے لگا تھا۔

آج عبداللہ کو ملک کی سب سے بڑی یونیورسٹی سے فون کال آئی۔

جی آپ نے ہمارے Ms leading to Phd پروگرام میں اپلائی کیا ہے،مگر آپ کے 40 کریڈٹ ہاورز کم ہیں۔گورنمنٹ نے کچھ عرصہ پہلے بیچلرز پروگرام چار سال کا کر دیا ہے جب کہ آپ نے دو سال کا کیا ہے۔

تو آپ کے ماسٹرز کے کورسز ملانے کے باوجود آپ کی 40 کریڈٹ ہاورز کم ہیں آپ انہیں مکمل کر کے اگلے سال پھر اپلائی کیجئے گا۔

ہماری یونیورسٹی کے انتخاب کا شکریہ!

یا اللہ! یہ کیا مصیبت ہے؟ دو سال میں یہ حال ہوا تھا اگر چار سال لگاتا تو جنازہ ہی نکل جاتا۔اب یہ یونیورسٹی TDL لسٹ پر بھی تھی،چھوڑ تو سکتا نہیں تھا۔تو عبداللہ نے اسی یونیورسٹی میں جہاں کام کرتا تھا ویک اینڈز پر ایگزیکٹو پروگرام میں داخلہ لے لیا۔

ایک سال میں ایک ماسٹرز اور کر لیا،یہ بھی کمپیوٹر سائنس میں۔

اگلے سال پھر ایڈمیشن نہ ملا،آٹھ کریڈٹ ہاورز کا فرق رہ گیا،اب عبداللہ نے شہر کی ایک

اور یونیورسٹی میں شام میں ماسٹرز پروگرام میں داخلہ لے لیا، کمپیوٹر سائنس پہ اتنا عبور تھا کہ کلاس لے یا نہ لے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ اس بات کو نئی یونیورسٹی کے وائس پریزیڈنٹ نے فوراً نوٹ کر لیا ان کا نام تھا ڈاکٹر حیدر۔

ایک دن عبداللہ کو اپنے آفس میں بلایا اور کہا کہ ''میاں، کیوں ٹائم ضائع کر رہے ہو، عبداللہ نے سارا ماجرا کہہ سنایا، کہنے لگے اس سال اپلائی کرو تو Recommendation لیٹر مجھ سے لکھوا لینا۔

پتہ نہیں انہوں نے ایسا کیا لکھا کہ بڑی یونیورسٹی میں داخلہ بھی ہو گیا اور 100% اسکالرشپ بھی مل گئی اور ساتھ میں Teaching Assistant کی جاب اور 15 ہزار تنخواہ بھی۔

اب ایک طرف TDL کا ایک ٹاسک تو دوسری طرف لگی لگائی جاب، بیوی، بچہ، یہاں تنخواہ لگ بھگ کوئی 60 ہزار روپے ہو چکی تھی۔ مگر عبداللہ نے جوٹھان لی سوٹھان لی۔ اپنی بلّو سے مشورہ کیا، اس نے کیا کہنا تھا ہاں میں ہاں ملا دی اور یوں عبداللہ نے استعفیٰ جمع کروا دیا۔

ڈر تھا تو صرف ایک کہ رفیع صاحب کا سامنا کیسے کرے گا کہ وہ احسان کرنے والے تھے انہوں نے منع کر دیا تو کیا ہوگا۔ آج عبداللہ جو کچھ بھی تھا وہ اوپر اللہ اور نیچے رفیع صاحب کی ہی بدولت تو تھا۔

آج وہ رفیع صاحب کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

انہوں نے کہا:

دیکھو عبداللہ تم جانتے ہو کہ تم مجھے کتنے عزیز ہو، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم جذباتی کوئی فیصلہ نہ لو، تمہاری عمر کیا ہے؟

سر 23 سال۔

اور تنخواہ؟

سر 60 ہزار کے لگ بھگ۔

اللہ کے بندے، اس عمر میں یہ تنخواہ، خوبصورت بیوی اور بچہ، لائف سیٹ ہے اور تم استعفیٰ دے کر پھر سے طالب علم بننے کا سوچ رہے ہو۔ This is Financial Suicide

جی سر بالکل، کسی سے شرط لگا بیٹھا ہوں جانا ہوگا۔

کسی سے شرط لگائی ہے، میں بات کرتا ہوں اس سے۔

نہیں سر رہنے دیں، بس اجازت مرحمت فرما دیں، اللہ آپ کا بھلا کرے گا۔

چلو میں تمہیں ایک آفر دیتا ہوں، تم مجھ سے پانچ سال کا Contract سائن کرلو میں تمہاری تنخواہ بڑھا کے ایک لاکھ کر دیتا ہوں، مگر پانچ سال تک پھر جانے کا نام نہیں لینا۔

عبداللہ کے سامنے اپنے باپ کے الفاظ گونج اٹھے۔

مگر اس نے دل پر پتھر رکھ کے کہا۔

سر ایک بات بتائیں۔

ایک آدمی کتنے فی صد بچت کر سکتا ہے؟ کیونکہ Economics کا کلیہ ہے:

Expenses are raised to meet the Income.

آپ جتنا زیادہ کماتے ہیں آپ کے خرچے اتنے ہی بڑھ جاتے ہیں۔

کم کمانے والے بسوں میں سفر کرتے ہیں اور ان کے بچے نئی روشنی میں جاتے ہیں، زیادہ کمانے والے جہازوں میں اڑتے ہیں اور ان کے بچے پرائیوٹ اسکولوں میں مہنگی تعلیم حاصل کرتے ہیں، بچتا کچھ نہیں ہے دونوں کے پاس۔

یورپ والے مشہور ہیں بچت کے لیے وہ بھی صرف پانچ فی صد بچا پاتے ہیں۔

دیکھو اگر دھیان سے خرچ کرو تو شاید پچاس فی صد تک بھی بچا لو، رفیع صاحب نے کہا۔

سر یہ بتائیں، آپ کے پاس جو امپورٹڈ گاڑی ہے وہ کتنے کی ہے؟

88 لاکھ۔

اچھا اور ڈیفنس کا گھر؟

6 کروڑ

تو سر اگر میں یہ ''شاندار'' جاب پوری زندگی کرتا رہوں اور میری آنے والی سات نسلیں بھی کرتی رہیں تو میں نہ آپ کے جیسا گھر لے سکتا ہوں نہ کار۔ بھاڑ میں جائے ایسی جاب۔

میری منزل کچھ اور ہے سر مجھے جانا ہوگا۔

اور آخر کار ریکٹر صاحب نے استعفیٰ پہ دکھی دل کے ساتھ دستخط کر دیئے۔ وہ پودا جو انہوں نے پانچ سال پہلے لگایا تھا آج ایک تناور درخت تھا۔

☆☆☆☆☆

نئ یونیورسٹی، نئے لوگ، کم پیسے، عبداللہ ہر چیز کو انجوائے کر رہا تھا، کچھ پیسے بنک میں پسِ پشت ڈال رکھے تھے جن سے گزارہ بڑا اچھا ہو رہا تھا، عبداللہ ہوسٹل میں رہتا تھا اور بیوی بچے ایک کمرے میں پاس ہی ایک گھر میں Paying Guest کے طور پر۔ عبداللہ کو جب بھی ٹائم ملتا وہ یا تو انہیں یونیورسٹی بلا لیتا یا ان کے پاس چلا جاتا۔ بیوی بچے والا وہ شاید ایک ہی طالب علم تھا اپنی کلاس میں۔

☆☆☆☆☆

اخبار سے عبداللہ کا یارانہ بہت پرانا تھا۔آج اخبار میں اس کی نظر امریکہ کی مشہور زمانہ سینیٹر اسکالر شپ[Senator Scholarship] پر پڑی۔

Eligibilty Criteria میں TOFEL اور GRE شرط تھے اور Subjective GRE کے اضافی مارکس۔

عبداللہ نے تمام اساتذہ اور دوستوں کے منع کرنے کے باوجود اپلائی کر دیا اور TOFEL اور GRE کی تیاری میں لگ گیا۔سب کا خیال تھا کہ اس اسکالرشپ کے حصول کے لیے بلا مبالغہ ہزاروں لوگ اپلائی کرتے ہیں اور سیٹیں صرف چار۔

عبداللہ نے بڑی محنت سے اسکالرشپ کے مضمون لکھے اپیلی کیشن لکھی اور Recommendation لیٹرز جمع کروائے۔ایک اس نئی یونیورسٹی سے،ایک رفیع صاحب سے اور ایک عبدالرحمٰن صاحب سے[اردو میں]۔

نجانے ان لوگوں نے کیا لکھا،یا اپیلی کیشن کے مضامین کا کرشمہ یا کوئی دعا کا نتیجہ کہ عبداللہ شارٹ لسٹ ہو گیا صرف 22 بندوں کو انٹرویو کال آئی پاکستان بھر میں سیٹوں کے لیے اور عبداللہ ان میں سے ایک تھا،عبداللہ دن رات TOFEL اور GRE کی تیاری میں لگ گیا،ایک ہی دن میں دونوں پرچے شیڈول کروا لیئے مگر قدرت کو شاید کچھ اور منظور تھا۔TOFEL سے تین دن پہلے عبداللہ کی ماں کو ہارٹ اٹیک آ گیا۔

عبداللہ بھاگ کے گاؤں پہنچا،جو جمع پونجی تھی وہ علاج پہ لگ گئی۔

اور ماں کی کچھ حالت بہتر ہوئی تو عبداللہ نے جیسے تیسے پیپرز دیئے۔

اس گہما گہمی اور پریشانی میں نہ تو یونیورسٹی کا رزلٹ کچھ بہتر آیا،یونیورسٹی نے Probation پہ ڈال دیا اور اسکالرشپ کینسل کر دی تو دوسری طرف TOFEL میں واجبی سے مارکس، ہاں GRE میں عبداللہ نے 90% مارکس حاصل کر لیئے۔

☆☆☆☆☆

آج عبداللہ اپنی بلّو کے ساتھ ملک کے دارالحکومت کی طرف سینٹر اسکالرشِپ کے آفس کی طرف جارہا تھا، بس میں سفر کرتے ہوئے اپنی بیوی سے کہنے لگا:

دیکھ بلّو، یہ تو غلطی سے شاید انہوں نے مجھے کال کرلیا ہے، یہ اسکالرشپ وغیرہ میرے نصیب میں کہاں؟

اس بہانے ہم دونوں امریکن ایمبسی دیکھ لیں گے ورنہ ہمیں وہاں کون گھسنے دے۔

خیر جب تمام Candidates اس بات کی پریکٹس کررہے تھے کہ کیا پوچھیں گے تو کیا بولیں گے اور اپنی ہی جمع کروائی ہوئی درخواستوں کو بار بار پڑھ رہے تھے ایسے میں عبداللہ اور بلّو سارے آفس میں گھوم گھوم کر تصویریں دیکھ رہے تھے اور ہر گورے یا کالے امریکی سے ہاتھ ملا ملا کر فخر محسوس کررہے تھے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں اتنے سارے امریکی ایک ساتھ پہلے کبھی نہ دیکھے تھے، عبداللہ کی پروفائل سب سے کمزور تھی۔

سب لوگ بڑے شہروں کے تھے، انگلش میڈیم اسکولوں کے پڑھے ہوئے، ان کی انگریزی اور شاندار تلفظ دیکھ کے ہی عبداللہ کو یقین ہو چلا تھا کہ اس کی دال یہاں نہ گلے گی۔

خیر آخر اس کا نمبر آ ہی گیا۔

کانپتے قدموں، لرزتے ہاتھوں، دھڑکتے دل، لڑکھڑاتی زبان مگر شوخ آنکھوں کے ساتھ دبلے پتلے عبداللہ نے آفس میں قدم رکھا۔

ابھی بمشکل کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ سوال ہوا:

تو آپ امریکہ جانا چاہتے ہیں؟

جی آپ کو کس نے کہا؟

اسی لیے تو آپ یہاں موجود ہیں؟

دیکھئے جناب، PhD کرنی ہے کیونکہ وہ میری TDL پر ہے، پیسے میرے پاس ہیں نہیں، آپ جہاں چاہیں بھیج دیں بس فیس بھر دیں۔

امریکہ سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟
جی جنگوں کا شوق ہے یا بندے مارنے کا عراق ہو یا افغانستان۔
کیا آپ کی باتوں سے میں یہ سمجھوں کہ آپ کو امریکہ سے نفرت ہے؟
جناب نفرت تو بڑا بھاری لفظ ہے، مگر مجھے محبت بھی کیسے ہو؟
آپ جانیں دیں، شاید دیکھوں تو محبت ہو جاوے۔
نیشنل ایمرجنسی کی صورت حال میں کس کا ساتھ دو گے؟
جی پاکستان کا، ملک ماں ہوتا ہے اور ماں کا ساتھ کون چھوڑتا ہے۔
ہمیں نہیں لگتا کہ آپ امریکہ جا کر واپس آئیں گے؟
نہیں، ایسا نہیں ہے، مجھے واپس آنا ہے۔
ہم کیوں مان لیں کہ آپ سچ کہہ رہے ہیں۔
کیونکہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔
آپ جھوٹ کیوں نہیں بولتے؟
''اللہ پوچھے گا۔''

اور انٹرویو ختم۔ واپسی پر بلّو نے خوب صلوٰتیں سنائیں کہ یہ کیسا انٹرویو دے کر آئے ہو، جھوٹی موٹی تعریف نہیں کر سکتے تھے، عبداللہ نے کہا، میں سچ بولتا تھوڑا ہی ہوں، خود بخود زبان سے نکل جاتا ہے۔

نکل جاتی ہو سچی بات جس کے منہ سے مستی میں
فقیہہِ مصلحت بین سے وہ رندِ بادہ خوار اچھا

کچھ ہفتوں بعد عبداللہ کی کمپیوٹر سائنس پر لکھی ہوئی پہلی کتاب منظرِ عام پر آئی [اور یوں TDL سے ایک آئٹم اور کم ہوا]، اسی روز سینٹر اسکالرشپ میں Selection کا لیٹر ملا، عبداللہ کے پاؤں زمین پر نہیں ٹِک رہے تھے، مگر اسی شام اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ عبداللہ کئی

روز روتا رہا، نہیں اللہ سائیں، یہ تو T D L میں تھا نہیں، یہ کیسے ہو گیا، یہ کیوں ہوا، مگر جذبات کا جوار بھاٹا چند ہی دنوں میں معدوم ہو گیا۔ اور یوں عبداللہ امریکہ روانہ ہوا۔

☆☆☆

امریکہ میں عبداللہ اپنے بیوی بچے کے ہمراہ بڑا خوش تھا، عجیب دنیا تھی وہ تمام برائیاں جو ملکی معاشرے میں اس کے لیے مصیبت بنی ہوئی تھیں وہ تمام خوبیاں بن گئیں۔

سوال پوچھنے پر استاد خوش ہوتے ، سچ کو معاشرے میں سراہا جاتا، جھوٹ سے نفرت کی جاتی، ہر بندے کو اسکے حصے کی عزت ملتی، آپ لائن میں کھڑے ہیں تو ہر بندہ لائن میں کھڑا ہے بھلے معاشرے میں اس کا مقام کیا ہی ہو۔

عبداللہ کو احساس ہوا کہ ہم معاشرے میں کسی شخص کی عزتِ نفس کو اتنی بار مجروح کرتے ہیں کہ اس میں خود اعتمادی ہی نہیں رہتی اور وہ پھر جو چاہے وہ کر گزرتا ہے۔

یہاں آ کر عبداللہ کی صحت بہت اچھی ہو گئی۔ اس نے ایک اور ماسٹرز کیا۔

کچھ عرصہ جاب کی ، پھر جزیرہ ہوائی میں ایک اسکالرشپ مل گئی وہاں چلا گیا، وہاں سے آیا تو سینٹر اسکالرشپ والوں نے اس کا شاندار اکیڈمک ریکارڈ دیکھتے ہوئے دوسری بار اسکالرشپ دے دی PhD کے لیے۔

اور بالآخر پانچ سال کی دن رات محنت کے بعد عبداللہ کو PhD ڈگری مل گئی۔ اس نے آج پھر چار میں سے چار GPA لے کر یونیورسٹی کے بہترین طالب علم کا اعزاز پایا۔

اس عرصے میں عبداللہ متعدد ملکوں میں گھوما، درجن بھر سے زائد کتابیں لکھیں، مقالہ جات اور ریسرچ پیپرز کی تعداد پچاس سے تجاوز کر گئی، سات Patent اپنے نام کرا لیئے اور ملنے والے Awards کی ایک لمبی لائن تھی جو عبداللہ کے C.V میں ہر اس شخص کا منہ چڑا رہی تھی جو اسے کوڑھ مغز کہتا تھا۔

عبداللہ کو اللہ سائیں نے دو اور بیٹوں سے نوازا۔ اسکالرشپ کی رو سے ابھی عبداللہ کے واپس

جانے میں چار ماہ تھے۔اسے .M.I.T سے ایک آفر آئی تو کام کرنے وہاں چلا گیا اور وہاں سے اسے سافٹ وئیر ٹیسٹنگ کا ایک پراجیکٹ ناسا میں مل گیا۔تنخواہ تھی 240 ڈالرز فی گھنٹہ۔

کام کرتے ہوئے اچانک ایک دن عبداللہ بھاگتا ہوا گھر پہنچا اور اپنی TDL لسٹ نکالی جو اس نے ایک عرصے سے نہیں دیکھی تھی۔

عبداللہ جوں جوں لسٹ پڑھتا گیا اس کے چہرے کا رنگ اڑتا چلا گیا، یا خدایا، کوئی آئیٹم ایسا بچا ہی نہیں تھا جو ٹِک ہونے سے رہ گیا ہو، آخری چند آئٹم اس نے آج ٹِک کر دیئے۔

عبداللہ گھنٹوں بیٹھا خلاؤں میں گھورتا رہا اور پھر اس کے رونے کی آواز نے اس کی بیوی بچوں کو گہری نیند سے جگا دیا۔

بیوی ،جو گواہ تھی اس کے پچھلے دس سالوں کی لگاتار اور انتھک محنت کی، بے قراری سے بولی، کیا ہوا، کیا ہو گیا ہے عبداللہ، سب خیریت تو ہے، تم کیوں رو رہے ہو، بتاؤ تو سہی ہوا کیا ہے، تم تو ایسے کبھی بھی نہ روئے۔

بلّو وہ لسٹ تھی نہ TDL والی، ہاں ہاں کیا ہوا اس کو۔

بلّو وہ مکمل ہو گئی۔

Every Damn Thing got ticked off.

wow تو چلو جشن مناتے ہیں، تم کیا ناشکروں کی طرح رو رہے ہو، چلو اٹھو باہر جا کے کھانا کھاتے ہیں۔

نہیں بلّو، ہاتھ ہو گیا ہے، کیا مطلب؟

بلّو آدمی کسی چیز کے پیچھے بھاگ رہا ہو اور بھاگتا ہی چلا جا رہا ہو اور وہ چیز اسے مل جاوے تو سکون آتا ہے، قرار ملتا ہے، دِل کا خلأ بھر جاتا ہے۔

مگر میرے ساتھ تو ایسا کچھ نہیں ہوا۔

تم دوڑتے پھرتے تو ہو ہو تا رِگ جاں پر
ایسے میں اگر پاؤں پھسل جائے تو کیا ہو۔

وہ دل کا خلأ تھا نہ وہ بڑھ کے گز بھر کا ہو گیا ہے۔ یا اللہ میں کیا کروں۔ میں شرط ہار گیا، اور اب مجھے وہ کرنا ہے جو تو کہے، مگر اللہ سائیں تیری TDL تو مجھے پتہ ہی نہیں ہے، میں نے کبھی اس پر دھیان ہی نہ دیا۔

اور اگر دنیا یہی چاہتی تھی مجھ سے تو میں نے وہ سب کچھ کر دکھایا جو دنیا نے، ماں باپ نے، رشتہ داروں نے، عزیز و اقارب نے، دوستوں اور دشمنوں نے مجھ سے چاہا، اب کیا کروں میرے ربا، میں اب مزید زندہ کیوں رہوں؟

آخر میں ہوں کیوں؟

تو نے مجھے پیدا کیوں کیا؟

میری زندگی کا مقصد ہے کیا؟

یارب! دس سال ضائع ہو گئے تو جانتا ہے اٹھارہ گھنٹے روز کام کیا ہے، عید، بقر عید، رمضان کچھ بھی ہو، بارش یا طوفان میں کام کرتا رہا، نہ ماں باپ پر دھیان، نہ بیوی بچوں کو ٹائم میں کام کرتا رہا، کتنے آلام و مصائب آئے میں لگا رہا، کتنی خوشیاں آئیں جو میں نے لمحہ بھر کو رک کے نہیں دیکھیں، میں کام کرتا رہا۔

مگر آج، آج میں پھر خالی ہوں، سب کچھ ملنے کے باوجود میرے اللہ سائیں میں پھر وہیں پہنچ گیا جہاں سے شروع ہوا تھا۔

میں کیا کروں اب؟

میرے اللہ جواب دے۔

ہاتھ الجھے ہوئے ریشم میں پھنسے بیٹھے ہیں
اب بتا! کون سے دھاگے کو جدا کس سے کریں؟

اور یہ کہتے کہتے عبداللہ کو Anxiety کا دورہ پڑا اور اسے ہسپتال میں ایڈمٹ کرنا پڑا۔

وہ تمام تر رعنائیاں، شوخیاں اور امارت کی چیزیں جو کبھی چاہی جاتی تھیں آج عبداللہ کی نظروں میں

بے معنٰی ہوگئیں۔وہ تو شکر ہے کہ لسٹ دس سالوں میں پوری ہوگئی وگرنہ شاید زندگی بھراسی میں لگا رہتا اور جب فرشتے قبر میں آکے پوچھتے: فِیۡمَ کُنتُم

﴿ إِنَّ الَّذِيۡنَ تَوَفّٰهُمُ الۡمَلآئِكَةُ ظَالِمِىۡ أَنۡفُسِهِمۡ قَالُوا فِيۡمَ كُنتُمۡ قَالُواۡ كُنَّا مُسۡتَضۡعَفِيۡنَ فِى الۡأَرۡضِ قَالُوۡاۡ أَلَمۡ تَكُنۡ أَرۡضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُواۡ فِيۡهَا فَأُوۡلَئِكَ مَأۡوَاهُمۡ جَهَنَّمُ وَسَاءتۡ مَصِيۡرا ﴾ [سورۃ النساء۴:۹۷]

''جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں جب فرشتے ان کی جان قبض کرنے لگتے ہیں تو ان سے پوچھتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم ملک میں عاجز و ناتواں تھے۔فرشتے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کا ملک فراخ نہیں تھا کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ ایسے لوگوں کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بُری جگہ ہے۔''

تو کیا جواب دیتا۔

عبداللہ کی حالت اس جُواری کی سی تھی جو اپنا سب کچھ ہار گیا ہو، ایسے شخص کی جسے منزلِ پہ پہنچ کے پتہ لگا ہو کہ یہ منزل اس کی تھی ہی نہیں۔

جو لوٹ آئیں تو کچھ کہنا نہیں، بس دیکھنا انہیں غور سے
جنہیں منزلوں پر خبر ہوئی یہ راستہ کوئی او رتھا

وہ تمام لوگ جو عبداللہ سے پیار کرتے تھے، اس سے مخلص تھے، جن کی عبداللہ قدر کرتا تھا، ماں باپ، رشتہ دار، دوست واحباب، سب نے مل کے جھوٹ بولا اور اپنے ایجنڈے پہ لگا دیا۔

اب کس پہ یقین کرے، کس سے رجوع کرے، کس کی بات مانے، کس کو دُہائی دے، آج عبداللہ کا کوئی نہیں رہا تھا، وہ بالکل اکیلا ہو گیا تھا۔

اپنائیت کے کرب سے گزرا ہوں اس طرح
رشتوں پہ اعتماد کا یارا نہیں رہا

☆☆☆☆☆

عبداللہ نے گھر پہنچ کے جاب سے استعفیٰ دیا اور سوالوں کی ایک لمبی لسٹ بنائی کہ جن لوگوں کو وہ عقلمند سمجھتا ہے ان سے جا کے پوچھے گا۔ اگر تو جواب مل گئے تو مسئلہ ختم ورنہ وہ بھی اپنی لسٹوں میں کہیں گم ہیں۔ اور پھر ان کا نام عقل مند لوگوں کی لسٹ سے خارج کر دے گا۔

سوال کچھ اس طرح کے تھے۔

☆ میں کون ہوں؟

☆ انسان کسے کہتے ہیں؟

☆ بندہ کسے کہتے ہیں؟

☆ ہمارا مقصدِ حیات کیا ہے؟

☆ زندگی کا Vision کیا ہونا چاہئے؟

☆ ہر وہ چیز جس کی آپ خواہش کر سکیں وہ آپ کو مل جائے تو آپ کس کی خواہش کریں گے؟

☆ وہ زندگی جو ایک خواہش سے دوسری خواہش کی طرف سفر کرتی ہوا سے کیا نام دیں گے؟

☆ جانور اور انسان میں کیا فرق ہے؟

☆ آپ کو کیسے معلوم ہو کہ اللہ کے پاس آپ کا کیا مقام ہے؟

☆ اللہ آپ سے کیا چاہتا ہے؟

☆ میری TDL میں سے کتنی چیزوں سے متعلق سوال ہوگا؟

☆ ہم پر اللہ کا کیا حق ہے؟

☆ ہم پر اللہ کے نبی محمد مصطفیٰ ﷺ کا کیا حق ہے؟

☆ کیا ہمارا معاشرہ ہمیں اپنے رب سے دور کرتا ہے؟

☆ ترقی و علم سے ملنے والے غرور کا خاتمہ کیونکر ممکن ہو؟

☆ زندگی کس چیز کا نام ہے؟

☆ اللہ کیسے راضی ہوتا ہے؟

☆ میں یہ کیسے مان لوں کہ جو کچھ بھی آپ کہہ رہے ہیں میرا اللہ مجھ سے یہی چاہتا ہے؟
☆ کیسے پتہ چلے کہ زندگی کا Vision [خواب] زندگی کے مقصد سے جڑتا ہے؟
☆ یہ خوف کیسے نکلے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ ٹھیک ہے Sound ہے، یا کہ پھر دس سال بعد اسی جگہ پر آجاؤں گا؟
☆ اللہ سے معافی کیسے مانگیں؟
☆ دعا مانگنے کا طریقہ کیا ہو؟
☆ کامیابی کسے کہتے ہیں؟

ان سوالوں کو لے کر عبداللہ شہر بہ شہر، کُو بہ کُو پھرتا رہا، دنیا کے دس ممالک پھر لیئے، امریکہ کی 48 ریاستوں کی خاک چھان ماری اور جب کچھ نہ بن پڑا تو واپس پاکستان چلا آیا، یہاں بھی کوئی تین درجن سے اوپر شہر اور گاؤں گھوم ڈالے، جو کچھ کمایا اور بچایا تھا وہ اس صحرانوردی کی نظر ہو گیا، مگر دل کا قرار ایسا اُجڑا کہ آنکھیں ویران اور دل بنجر ہو گیا۔

کتنے ہی لوگ تھے اس کے ذہن میں جنہیں وہ اپنا آئیڈیل اور اور رول ماڈل سمجھتا تھا، بڑی بڑی سافٹ ویئر کمپنیوں کے مالک، ملٹی نیشنل کمپنیوں کے بے تاج بادشاہ، مفکّر، اسکالرز، ریسرچرز، پروفیسرز، گاؤں کے بوڑھے سنیاسی، شہر کے بزنس مین، مفتی صاحبان، مولوی حضرات، الغرض کوئی عبداللہ کو مطمئن نہ کر سکا، اور ایک ایک کر کے تمام نام لسٹ سے خارج ہو گئے۔

ہر کوئی اپنی دنیا میں مگن خوش وخرّم، کوئی پلاٹ خریدنے کا مشورہ دے تو کوئی گھر بنانے کا، کوئی ''روحانی منزلیں'' طے کرنے یا کروانے کی ''گارنٹی'' دے تو کوئی انسانیت کی خدمت میں سکون پانے کا مشورہ دے۔

مگر ایک عبداللہ تھا جس کے دل کی ویرانی، روز بروز بڑھتی ہی جا رہی تھی، وہ اکثر لوگوں کو مخاطب کر کے کہتا:

اپنی خوشی کے ساتھ میرا غم بھی ملا دو
اتنا ہنسو کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑیں

اس ادھیڑ بُن میں اچانک اسے خبر ملی کہ چاچا دینو کا انتقال ہو گیا ہے، یہ خبر بجلی بن کے گری پہلے سے بوسیدہ حال عبداللہ پر۔

چاچا دینو ہی تو ایک ٹمٹاتا ہوا روشنی کا چراغ تھا اس کی اندھیری دنیا میں، وہ بھی گیا۔

یا اللہ! یہ تو سارے راستے ہی مسدود ہو رہے ہیں، تو چاہتا کیا ہے؟

نجانے کس طرح عبداللہ نے چاچا دینو کا جنازہ پڑھا اور انہیں قبر میں اتارتے وقت وہ یہ شعر پڑھ رہا تھا:

رشک آزادی پہ ہے ایسے اسیروں کی مجھے
چُھٹ گئے جو جان دے کر پنجۂ صیّاد سے

عبداللہ کی حالت دن بدن گرتی جا رہی تھی، داڑھی الجھ گئی تھی، کبھی بال بڑھ جاتے تو کبھی وہ گنجا ہو جاتا، گھر والے، سسرال والے سب پریشان تھے۔

آج عبداللہ نے سر عبدالرحمٰن سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ عبداللہ دل ہی دل میں سب سے ہی ناراض تھا کہ کسی نے بھی اس راستے پہ چلتے ہوئے خبر دار نہ کیا۔ جیسے ہی عبدالرحمٰن صاحب نے عبداللہ کی حالت دیکھی ان کے منہ سے بے اختیار نکلا:

بتا رہی ہے یہ آنکھوں کی منجمد لالی
کڑے دنوں، کٹھن رتجگوں سے گزرے ہو۔
خزاں خزاں سا یہ چہرہ، دھواں دھواں آنکھیں
خوشی کی کھوج میں کتنے غموں سے گزرے ہو؟

عبداللہ سے آنسو ضبط نہ ہو سکے اور وہ ان سے گلے مل کے نجانے کتنی دیر روتا رہا۔

آخر جب عبدالرحمٰن صاحب نے اس کے سوالوں کی کھوج میں اس کی مدد کا فیصلہ کیا تو عبداللہ کو کچھ

قرار آیا۔

عبدالرحمٰن صاحب نے عبداللہ سے کہا کہ جوابات تو تمہیں بہت سے لوگ دے چکے ہیں، مسئلہ ہے تمہارے دل کے اطمینان کا، تمہارے دل کو کوئی بات لگتی ہی نہیں ہے، کوئی ایسا درد، ایسی چبھن، ایسا خلأ ہے جو تمہیں چین سے بیٹھنے نہیں دے رہا ہے، اب تمہیں کتنے ہی جواب کیوں نہ مل جائیں تمہارا مسئلہ ایسے حل نہیں ہوگا۔

محبت میں تپاکِ ظاہری سے کچھ نہیں ہوتا
جہاں دل کو لگی ہو، دل لگی سے کچھ نہیں ہوتا

عبدالرحمٰن صاحب نے کچھ دوستوں سے مشورہ کر کے حل بتانے کا وعدہ کیا اور عبداللہ ایک موہوم سی امید کے ساتھ گھر روانہ ہوا۔

کافی دن گزر گئے عبدالرحمٰن صاحب کا کوئی جواب نہیں آیا، عبداللہ پہلے تو یہ سوچ کے انتظار کرتا رہا کہ وہ دوستوں سے مشورہ کر رہے ہوں گے، مگر آج کافی دنوں بعد اس نے ان کے گھر پہ فون ملایا۔

بیٹے سے بات ہوئی، کہنے لگا، ابّو کو فالج اور لقوہ کا اٹیک ہوا ہے اور وہ ہسپتال میں ہیں، عبداللہ کے ہاتھ سے رسیور گر گیا۔

جا کے عیادت کی، ڈاکٹرز نے بتایا حالت بہتر ہو جائے گی مگر شاید دوبارہ بولنے اور چلنے پھرنے میں کئی سال لگ جائیں۔

عبداللہ سامنے جا کر بیٹھ گیا مگر عبدالرحمٰن صاحب کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک تک نہ تھی کہ بیماری سے ذہن متأثر ہوا تھا۔

عبداللہ نے آنکھ اٹھا کے آسمان کی طرف دیکھا اور ایک آنسو اس کی ڈاڑھی بھگوتا ہوا زمین پہ آ گرا۔

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لیے
بادلو! ہٹ جاؤ، دے دو راہ جانے کے لیے

آج عبداللہ نے نہادھوکر نئے کپڑے پہنے ،مسجد میں جا کر نماز پڑھی، بیوی بچوں کے ساتھ کھانا کھایا،سب ہی اس کا یا پلٹ پر حیران تھے، بلّو کو یہ کوئی طوفان کا پیش خیمہ لگ رہا تھا۔

جب علیحدگی نصیب ہوئی تو وہ عبداللہ سے کہنے لگی:

عبداللہ! کیا ہوا،تم ٹھیک تو ہو،کہیں انٹرویو کے لیے جارہے ہو کیا؟

نہیں بلّو،اب مجھ سے یہ درد نہیں سہا جاتا،آج فیصلہ ہو کر ہی رہے گا۔

کیا مطلب؟

آج میں ایک بار پھر،آخری بار،اللہ سے مانگوں گا،اپنے سوالات کے جوابات،اور دل کا سکون ،اگر مل گیا،تو ٹھیک،ورنہ.....

ورنہ کیا؟.....بلّو کے منہ سے چیخ نکلی۔

ورنہ میرے بچوں کا خیال رکھنا۔

بلّو تو مصلّے پر ڈھیر ہوگئی کہ اُسے عبداللہ کے آہنی عزم کا بھرپور ادراک تھا، پتہ نہیں کب تک وہ کیا کیا مانگتی رہی اسے خبر تھی کہ آج فیصلے کی رات ہے۔

جب سارے گھر والے سو چکے تو عبداللہ چپکے سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا، بلّو نے بھی چپکے سے پیروی کی۔

عبداللہ، برابر والے کمرے میں مصلّے پر تہجد پڑھ رہا تھا،نماز سے فراغت کے بعد اس نے ہاتھ اٹھائے:

''اللہ سائیں!

تجھے تو پتہ ہے کیا ہوا؟ میں ہار گیا اللہ سائیں۔وہ بدنصیب کہ جو سب جیت کے بھی ہار گیا۔اور تو ایسا بے نیاز کہ سب کچھ دے کے بھی پرواہ نہیں۔

میرے اللہ، دیکھ میری مدد کر، ورنہ میں مر جاؤں گا، میں نہیں رہ سکتا زندہ اب بغیر TDL کے،تو مجھے دے نئی TDL،ایسی TDL کہ جس کے ہر آئیٹم کو ٹِک کر کے میں تجھ سے قریب ہو جاؤں، میں

تجھ سے راضی تو مجھ سے راضی ہو جائے، اوسوال دینے والے اللہ، جواب بھی دے دے، او کُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ والے اللہ، میرا بھی مسئلہ Solve کردے، اوءَ اِلٰهٌ مَعَ اللّٰه والے اللہ میرے لیے کافی ہو جا، کھول دے بند گرہیں، ڈال دے دماغ میں کچھ، ختم کر یہ کشمکش، کردے رحم، دے دے آگہی، سُجھا دے کوئی راہ، کردے رہنمائی، تو کچھ لوگوں کو چھوڑ دیتا ہے بھٹکنے کو، کچھ کو راہ دکھاتا ہے، تو کسی کا ہاتھ پکڑ کر اسے چلاتا ہے او میرے شہ رگ سے قریب اللہ، میرا ہاتھ پکڑ، مجھے راہ دکھا، میرے پاس آ، میری مدد کر، او غار میں سکینہ اتارنے والے اللہ، او میرے مالک، او میرے مولا، اے میرے پالنہار، میڈا سائیں، میڈا یار، میرے مالک، آجانا، ہاتھ پکڑ، راستہ دکھا، روشنی دے اپنے نور میں سے، میرے آگے روشنی کر میرے پیچھے کر، میری دائیں کر میرے بائیں کر، میرے اوپر کر میرے نیچے کر، میں کیا کہوں گا منکر نکیر کو اگر پوچھ بیٹھے فِيمَا كُنْتُمْ؟ مارا جاؤں گا میرے اللہ، میری TDL انگارہ بنا کے نہ لگا دی جاوے۔ رحم کر میرے مولا، تو کر بھی لے، تجھے تیرے رحم کا واسطہ، تیرے حبیب کا واسطہ، واسطہ اس صحابی کا جس کے سینے سے نیزہ پار ہو گیا تھا اور وہ کہہ رہا تھا:

فُزْتُ وَرَبِّكَ الْكَعْبَة(۱)۔

واسطہ اس بات کا کہ تو میرا اللہ ہے اور میں تیرا بندہ۔

بچالے مجھے میرے مالک، میری سرکار، کر بھی دے مدد، سن بھی لے میرے مولا۔

میرے اللہ، سخی کی شان نہیں ہوتی کہ دے کر واپس لے، میرے مولا تو غافر الذنب ہے، تو سارے ہی معاف کر دے، دیکھ میں سجدے میں گر گیا، دیکھ میں نے ناک رگڑ لی، سجدے سے زیادہ Defenseless پوزیشن تو کوئی بھی نہیں ہے میرے اللہ۔ میں تیری توحید کا اقرار کرتا ہوں میرے رب، شرک سے بچتا ہوں میرے اللہ، ان دونوں کے بیچ میں ہونے والے گناہوں کو معاف کردے

تونے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

حشر میں حساب نہ کیجیو میرے اللہ، ایسے ہی چھوڑ دینا میرے اللہ، تو پوچھیو نہیں میرے اللہ، تو پوچھیو نہیں میرے اللہ، تو پوچھیو نہیں میرے اللہ۔

☆☆☆☆☆

(۱) صحیح البخاری، محمد بن اسماعیل البخاری، باب من ینکب فی سبیل اللہ، حدیث نمبر ۲۸۰۱، دار طوق نجاۃ، ۱۴۲۲ھ

اوراس کے بعد عبداللہ کی آواز جیسے گنگ ہوگئی، بول تو کچھ رہا تھا، مگر الفاظ پلّے نہیں پڑھ رہے تھے، رونے، سسکیوں، آہوں کی آواز میں سب کچھ دب چکا تھا، وہ ایسے ہوا میں ہاتھ مار رہا تھا جیسے کوئی ڈوبنے والا بچاؤ کے لیے ہاتھ پاؤں چلاتا ہے، بلّو جو یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی وہ دھڑام سے گر گئی اور نجانے کب عبداللہ کو بھی نیند آ گئی۔

بات ادھوری مگر اثر دونا
اچھی لکنت زبان میں آئی

صبح جب بلّو اٹھی تو رات کے واقع کی وجہ سے اس کا چہرہ سیاہ پڑا ہوا تھا، فوراً نظر دوڑائی تو عبداللہ نظر نہ آیا، ابھی ڈھونڈنے جا رہی تھی کہ وہ ہنستا مسکراتا کمرے میں داخل ہوا، آج بہت ہی بدلا بدلا اور سنبھلا ہوا لگ رہا تھا، آتے ہی ہمیشہ کی طرح بلّو پہ پھبتی کسی۔

کیا تیرا جسم تیرے حسن کی حدّت میں جلا
راکھ کس نے تیری سونے کی سی رنگت کر دی؟

پہلے والا عبداللہ دیکھ کے بلّو کی جان میں جان آئی۔

☆☆☆

اب عبداللہ کافی سنبھل گیا تھا، اس کے دل کو شاید کچھ چین مل گیا تھا، اس نے سمجھ لیا تھا کہ جو سوال تینتیس سالوں میں جمع ہوئے ہیں ان کا حل تینتیس دنوں میں نہیں ملے گا، وہ اب چلنا چاہتا تھا جستجو کے اس سفر میں۔

☆☆☆

کچھ دنوں بعد آج عبداللہ اپنے فیملی کے ساتھ ملک کی مایۂ ناز یونیورسٹی میں اسٹنٹ پروفیسر کی جاب جائن کرنے کے لیے جا رہا تھا۔ یونیورسٹی میں دیکھتے ہی دیکھتے عبداللہ کے نام کا ڈنکا بجنے لگا، ساتھ ہی عبداللہ نے اپنے بیوی بچوں پر خصوصا توجہ دینا شروع کی وہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا بہت خیال رکھتا۔

زندگی میں کچھ ٹھہراؤ سا آ گیا تھا، عبداللہ آج بھی نماز پڑھتا تو اللہ سے گھنٹوں دعائیں مانگتا، عبداللہ آج بھی اپنے اللہ کو خط لکھا کرتا۔

عبداللہ کی زندگی میں آج بھی بہت سے سوال آتے ہیں کچھ کا جواب مل جاتا ہے کچھ کا نہیں، مگر اسے اس بات کا احساس ہے کہ جس راہ پر وہ چل رہا ہے وہ اسے بھٹکنے نہیں دے گی۔

قدم ہو راہِ الفت میں تو منزل کی ہوس کیسی
یہاں تو عین منزل ہے تھکن سے چور ہو جانا

☆☆☆☆☆

آج یونیورسٹی میں کوئی اضافی سیمنار ہو رہا تھا Goals Settings پر کہ زندگی میں Goals کیسے بنائے جائے اور پھر ان پہ محنت کیسے کی جائے؟

تو عبداللہ جلدی گھر واپس آ گیا، گھر آتے ہی عبداللہ کو خبر ملی کہ اس کا بچہ انگلش کے امتحان فیل ہو گیا ہے، اس نے اپنے بیٹے کو بلا کے پوچھا کہ تمہاری انگلش تو بہت بہتر ہے تو کیا معاملہ ہوا؟

بیٹے نے کہا پاپا سراسر زیادتی ہوئی ہے انگلش کا پیپر تھا اس میں سوال آیا:

When was Quaid-e-Azam born?

میں نے جواب لکھا:

He was born on 14 August 1947.

ٹیچر نے نہ صرف میرے مارکس کاٹ دیئے بلکہ کلاس کے سامنے میرا مذاق بھی اڑایا۔

پاپا مجھے پتہ ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش پچیس دسمبر اٹھارہ سو چھتر ہے، مگر یہ انگلش کا پیپر تھا نہ کہ مطالعۂ پاکستان کا، آپ مجھے بتایئے:

How was my sentence gramatically wrong?

عبداللہ نے ہنستے ہوئے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور بیٹے سے پوچھا تو پھر آپ نے ٹیچر کو کیا کہا؟

بیٹے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

''اللہ پوچھے گا۔''

اسی زمیں اسی آسماں کے ساتھ رہے
جہاں کے تھے ہی نہیں ، اس جہاں کے ساتھ رہے

میں اپنے آپکو سلگا رہا ہوں اس توقع پر
کبھی تو آگ بھڑکے گی ، کبھی تو روشنی ہوگیّ

☆☆☆☆☆

جستجو کا سفر

یہ ایک داستان ہے اس مسافر کی جس کے رہبر اپنی سمت بار بار تبدیل کرتے رہے،
یہ کہانی ہے ایسے کردار کی جس کا مقصد خواہشوں کا حصول رہ گیا،
یہ قصہ ہے اک غریب کا جس پر معاشرے نے ترقی کے سارے دروازے بند کر دئے،
یہ سرگذشت ہے اس آشفتہ سر کی جس کے عزم کے سامنے کچھ نہ ٹھہر سکا،
یہ فریاد ہے اس مفلس کی جس پر زندگی ممنوع کر دی گئی،
یہ قصہ ہے اس دیوانے کا جسکی دیوانگی اسے اپنے رب تک لے گئی،
اور یہ دہائی ہے ایک عبداللہ کی جسے سب کچھ مل گیا سوائے اپنے رب کے۔

Narratives Pvt.Ltd

پوسٹ بکس نمبر : 2110 اسلام آباد
فون : 051-2613911
ای میل : info@narratives.pk
ویب سائٹ : narratives.pk

ISBN 978-969-9645-26-6
9 789699 645266 >
Price: 175/-

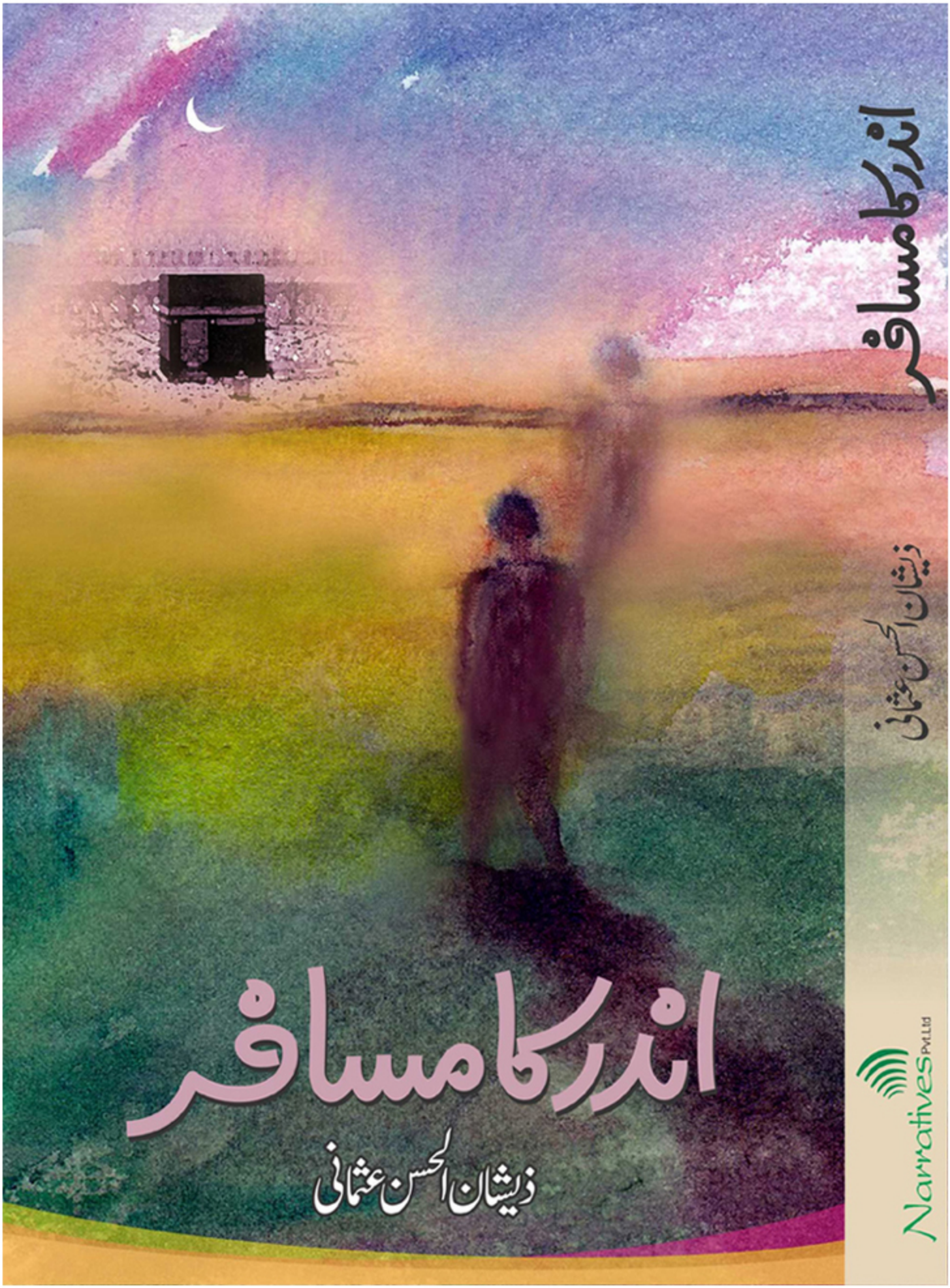
اندر کا مسافر
ذیشان الحسن عثمانی
اندر کا مسافر
ذیشان الحسن عثمانی
Narratives Pvt Ltd